

سلسلۂ مطبوعات جامعۂ عثمانیہ

(بی۔ اے، کے لیے)

رولرز آف انڈیا

(ہند کے حکمراں)

رنجیت سنگھ

(اور ہماری بڑھتی ہوئی حکومت ہند اور وسطی ایشیا میں سکھوں کا حائل ہونا)

مصنفہ

سر لیپیل گرفن کے۔ سی۔ ایس۔ آئی

ترجمہ

مولوی نظیر حسین صاحب فاروقی

مہتمم تعلیمات ضلع رائچور (حیدرآباد دکن)

سنہ ۱۳۴۰ھ م سنہ ۱۳۳۱ف م سنہ ۱۹۲۲ع

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن



یہہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی اجازت سے
اُردو مین ترجمہ کرکے طبع و شایع کی گئی ہے۔

فہرست مضامین

	صفحات از	صفحات تا
باب اول۔ تمہید	۱	۸
باب دوم۔ سکھ	۹	۲۳
باب سوم۔ سکھوں کی مذہبی حکومت (یعنی ایسی حکومت جس میں اُن کے مذہب کو دخل تھا)	۲۴	۴۷
باب چہارم۔ رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت پنجاب کی حالت	۴۸	۶۰
باب پنجم۔ مہاراجہ	۶۱	۷۷
باب ششم۔ رنجیت سنگھ کا دربار	۷۸	۹۲
باب ہفتم۔ رنجیت سنگھ کی فوج اور انتظام مملکت۔	۹۳	۱۰۹
باب ہشتم۔ اس کی ابتدائی فتوحات۔	۱۱۰	۱۲۰
باب نہم۔ انگریز اور آنر دی ستلج کا ملک	۱۲۱	۱۳۲
باب دہم۔ مابعد کے فتوحات	۱۳۳	۱۴۴
ضمیمہ۔		

دیباچہ

میں نے اس کتاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حالات اور اُن کے زمانے کے واقعات قلمبند کرنے میں اپنی سابقہ تالیفات "سرداران پنجاب" "راجگان پنجاب" "قانون وراثت متعلق بہ والیان ریاستہائے سکھ" سے جو قریب قریب ایک ہی مضمون کی کتابیں ہیں بہت کچھ مدد لی ہے۔ ان کتابوں کی تالیف میں میں نے اُس وقت اپنا بہت سا وقت صرف کیا تھا۔ کئی سال حالت ملازمت کے اور اسکے بعد بہت سے اوقات فرصت کے جہاں تک کہ ایک سرکاری ملازم کو فرصت مل سکتی تھی اسی کام میں صرف کیئے تھے۔ اور پنجاب خاص اور علاقہ جات آنروی ستلج کے سکھ خاندانوں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درباریوں اور مشیروں اور امرائے فوج کے حالات بہت تفصیل سے بیان کر دیئے تھے۔ اُس زمانے میں پنجاب کا کوئی شریف خاندان سکھوں کا ایسا نہ تھا جس سے میرا ذاتی تعارف نہ ہو۔ چنانچہ جو کچھ اطلاع ان لوگوں سے یا اُن کی اسناد سے جو اُن کے پاس تھیں ملی اور سرکاری کاغذات اور عہدناموں سے جسقدر باتیں معلوم ہوئیں ان سب کی مدد سے اُس زمانے کی ایک پوری تاریخ تیار کر دی تھی۔ اب اس کتاب کے لکھنے میں اپنی ہی سابقہ تالیفات کے مضامین کا اعادہ کرنا ایک مجبوری امر ہوا۔ سکھوں کی مذہبی حکومت کا جہاں ذکر آیا ہے اُسکا کچھ حصہ میں نے ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ صاحب کی کتاب ادی گرنت سے اور اکثر اعداد و نتائج ۱۸۸۱ء عیسوی کی کیفیت مردم شماری سے جس کو مسٹر ڈینزل ایبٹسن صاحب نے بڑی لیاقت سے تیار کیا تھا لیئے ہیں۔ اس امداد علمی کیلیئے میں ان دونوں لائق مصنفوں کا شکر گزار ہوں *

لیپل گرفن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رنجیت سنگھ

باب اول

تمہید

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جن اشخاص نے زور پکڑا تھا ان میں رنجیت سنگھ سے زیادہ نمایاں واہم کوئی شخصیت نظر نہ آئے گی۔ یہ شخص سکھوں کی قلیل المدت سلطنت کا جو لاہور میں قایم ہوئی بانی تھا۔ گزشتہ صدی کے آغاز میں ایک تلاطم وطوفان بے تمیزی برپا تھا اور اقوام ومذاہب میں باہمی کشمکش جاری تھی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اور ہوشیاری ومستعدی اور اپنی فطرتی ذہانت وفطانت سے کام لے کر اس نے گُرو گوبند کے فتنہ پرداز اور جنگجو معتقدین کو مجتمع کر کے ایک قوم بنا دیا۔ سکھوں کی تربیت پہلے ہی سے ایسے فوجی اصول پر کی گئی جس سے زیادہ کامل طریقہ نہ تو اس سے قبل جاری تھا اور نہ اُس کے بعد ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں رایج ہوا اور یہ جماعت رنجیت سنگھ کی سخت گیر اور جابرانہ حکومت کی ماتحتی میں ایک ایسا خوفناک اور قوی آلہ جنگ بن گئی کہ اس کے بعد وہ صرف اس وجہ سے شکستہ وکمزور ہو گئی کہ مہاراجہ کے جانشینوں نے اسے انگریزوں کے خلاف آمادۂ پیکار کیا۔

جس طرح نپولین کی سلطنت کا عروج۔ اس کی کامیابی کی چکاچوند۔ اور اس کا

قطعی زوال دفعتہً ہوا تھا بعینہ وہی حال سکھوں کی حکومت کا ہوا۔ لاہور کا مہاراجہ بھی اپنے ہمعصر نپولین بوناپارٹ کی طرح راجپوتوں مسلمانوں اور سکھوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے اتحاد پر جن کو اس نے خود برباد کیا تھا کوئی دیرپا سلطنت قایم نہ کر سکا اس کے فتوحات مستحکم نہ تھے اور اس کے مقبوضات کی حالت لکڑیوں کے گٹھے کے مانند تھی جو اس کی زندگی میں اس کے زبردست ملوکانہ عزم کی بندش سے جکڑے ہوے تھے۔ اور اِس بندش کے ٹوٹتے ہی یہ مقبوضات بکھر گئے۔ اِس کا تخت اس کی عظمت وسطوت کی روایتیں اِس کے نااہل جانشینوں کے ہاتھ میں آئیں جنھوں نے سلطنت کے جہاز کو ایسا بے قابو چھوڑ دیا کہ وہ بالآخر بربادی کے پہاڑ سے ٹکرایا اور بالکل پاش پاش ہو گیا۔

اِس قسم کی تاریخی مماثلت کو طول دینا بہت کچھ آسان ہے لیکن رنجیت سنگھ اور نپولین کی شخصیت وسلطنت نہ صرف ظاہری مشابہت کی وجہ سے تعجب خیز ہے بلکہ وہ اس سبب سے دلچسپ بھی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یکساں حالات کے نتایج ایشیا اور یورپ میں یکساں نکلتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے اسی زمانے میں اُمرا اور جاگیریت کے ظلم و بدسلوکی سے منحرف ہو کر اول اول فتح حاصل کی تھی اور وہ اس فتحمندی کے نشے میں سرشار ومخمور تھے اور سکھوں نے بھی اسی طرح ان ہی دنوں میں برہمنوں کی تباہ کن خودمختاری کے برخلاف ایک بغاوت عظیم برپا کی تھی۔ اور فرانسیسیوں کی طرح وہ بھی اس میں فتحمند ہوے تھے۔ مشرق ومغرب کے انقلاب پسندوں کو نپولین اور رنجیت سنگھ کے مثل سردار ہاتھ لگے جو فوجی ذہانت وطباعی قطعی خودغرضی بے رحمی وبداخلاقی میں ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے لیکن جو عظمت انھوں نے حاصل کی وہ اسے اپنے جانشینوں کو ترکے میں نہ دے سکے۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے سے تھوڑے دن قبل ہی نپولین کی سلطنت کی تجدید کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس تجدید کی کوشش سے اس امر کی اور بھی تصدیق ہو گئی کہ جانباز جاہ طلب اشخاص بہ آسانی کوئی حکومت قایم نہیں کر سکتے عامۂ ناس کسی ایسے سردار کی اطاعت بہ خوشی قبول کر لیتے ہیں جو لوگوں کا بڑا سرغنہ اور پیشوا ہو اور جو لوگوں کی آنکھوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دے

کہ اُس کی ذات اُن کو مجسّم ملکی شان وسطوت نظر آتی ہو۔ لیکن یہ چشم بندی اُسی شخص کی ذات تک محدود رہتی ہے اور اس کے ورثاء اور جانشینوں کی ہیئت نہیں بدلتی وہ تخت جو اُس کی قدرتی ذہانت نے قایم کیا تھا نہایت تبذل اور بدزیب نظر آتا ہے اُس کے زینے پر ایک مجمع بے باک لالچی طُفیلیوں کا جما ہوا نظر آتا ہے۔ جنھیں رعایا کو لوٹکر اپنا گھر بھرنے کے سوا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ حفظ مراتب اور اطاعت کی جگہ سازش اور بغاوت کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ پہلے جوش وخروش ہوتا ہے پھر تحقیر کی باری آتی ہے یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں یہ خود رو سلطنت فنا ہو جاتی ہے اور وہی لوگ جو اُس کی نمود کے وقت تعریفیں کرتے تھے اب اس کے خاتمے پر ہنستے نظر آتے ہیں۔ جو نپولین اور اس کے بعد اُس کے نام کی دوسری سلطنت کا حشر ہوا بعینہ وہی حالت رنجیت سنگھ اور اس کے بیٹے کھڑک سنگھ اور دوسرے جھوٹے مدعیان سلطنت کی ہوئی جو شیر پنجاب کی وراثت پر آپس میں لڑ مرے ؛

عالی شان قدیم خاندانوں کی سرنوشت اس سے کہیں مختلف ہے جن کا موروثی اعزاز نسلاً بعد نسل ایک سلسلے کی صورت میں برابر چلا آرہا ہے یہ سچ ہے کہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ایسی سلطنتیں بھی اپنے بعض جانشینوں کی بدکاریوں اور بے پروائیوں کی وجہ سے تباہ وبرباد ہو جاتی ہیں لیکن ان کے سنبھل جانے کے ذرایع کس قدر وسیع ہوتے ہیں۔ وہ کمزوری کیسا سنگین جرم اور وہ حماقت کس قدر ذلیل ہے جو ایک ایسی قوم کو جن کی گرویدگی کا قائم رکھنا آسان تھا برداشتہ خاطر کر دیتی ہے! بادشاہوں کے خداداد حقوق کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ستارے بھی اپنے دوران میں اُن کی بہبودی کے لئے ضرور کوشاں رہتے ہیں۔ اور کوئی امر من جانب اللہ اُن کا حافظ اور نگہبان ہے۔ اُن کی عزت اور محبت لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے جس کی منزلت صف آرا لشکر سے کہیں زیادہ ہے۔ قدامت سے لوگوں میں ایک سردار کی ضرورت کا اعتقاد اور انسان کی کمزوری اور محکوم بن کر رہنے کی خواہش ان کے تخت کی اصلی بنیادیں ہیں۔ جانباز نو دولت کی قایم کی ہوئی حکومت میں کسی وارث تخت کی ذرا سی لغزش یا چبھتا ہوا چٹکلا اُسے تاج سے محروم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن وہ حاکم جس کے خاندان میں پشتہا پشت سے حکومت چلی آتی ہو

اکاش کے دیوتاؤں کی طرح کڑک بجلیوں پر بھی اپنا تخت جمائے بیٹھا رہتا ہے۔ اور کسی طرح کا خوف اس کا دامن گیر نہیں ہوتا۔ اس کی غلطیاں بہت جلد فراموش اور اس کی حماقتیں ایک چھوڑ ستر دفعہ معاف کر دی جاتی ہیں۔ اور جب ایسے حاکم کو زوال ہوتا ہے تو قسمت کی کوتاہی کے علاوہ یہ زوال زیادہ تر نتیجہ اس بات کا ہوتا ہے کہ زمانے کی ضروریات کو یہ حاکم نہ سمجھ سکا اور ایک سیاسی خودکشی پر ارادہ کر لیا!

اگر یورپ میں یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے تو ہندوستان میں اس سے بھی بڑھ کر صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں میں قدامت پرستی اور پرانے طریقوں کی پابندی اور جو پیشہ مورثوں کے وقت سے ہوتا چلا آیا ہے اس کی عظمت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ کسی حاکم کے ذاتی اوصاف پر نظر نہیں کی جاتی۔ ایسے ملک میں جہاں خونی مجرموں اور ٹھگوں کی بھی ایک طرح پر عزت کی جاتی ہو کہ قتل و غارت ان کا آبائی پیشہ ہے اور جہاں وہ عورتیں بھی جن کو پاکدامنی سے کچھ واسطہ نہیں کسی نہ کسی دیوتا کی سرپرستی میں آ سکتی ہیں یہ امر ضروری ہے کہ بادشاہ کی ہیئت اور اس کی مطلق العنانی کو بادشاہی کے ضروری لوازم کا جزو اعظم شمار کیا جاوے۔ تاریخ ہند گو بادشاہوں کی مصیبتوں اور قتل کے واقعات اور شاہی خاندانوں میں تغیر و تبدل کے افسانوں سے بھری ہوئی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو باوجود ان امور کے شاہی تعظیم کے متعلق خواہ بادشاہ کی حکومت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو عامۃ خلایق کا جو اعتقاد ہے اس میں کسی قسم کا تغیر نظر نہیں آتا۔ ہندوستان میں ہر زمانے میں بہت کچھ تلاطم برپا رہ چکا ہے اس کے زرخیز قطعاتِ ملک سیکڑوں برس تک شمالی و مغربی گوشوں سے حملہ کرنے والوں کی جولانگاہ رہ چکے ہیں جنھوں نے ملک پر متواتر یورشیں کر کے اُسے تاخت و تاراج اور برباد کر کے روانہ ہوئے۔ اور خود اس ملک کی رہنے والی نسلیں اور قومیں ایک دوسرے کی مخالف ایک دوسرے کا قتل عام کرتی لڑتی بھڑتی چلی آئی ہیں۔ لیکن ملک کی رعایا عموماً اس خاندان کی دل سے وفادار رہی جو اس حصۂ ملک میں نسلاً بعد نسلٍ حکمراں رہا اور اس کی یاوریِ بخت و شومیِ طالع دونوں حالتوں میں اس کی حفاظت کرنے اور اس پر جان فدا کرنے پر آمادہ رہی۔ جو ریاستیں حملوں کے مدافعت کی قوت رکھتی ہیں مثلاً اودیپور۔ جیپور اور جودھپور یا خوش قسمتی سے حملہ آوروں کی زد سے

دُور یا کوہ ہمالیہ کی اندرونی وادی میں واقع ہیں مثلاً چمبا۔ منڈی اور سکیت وہ ایسے قدیم خاندانوں کے زیر حکومت ہیں جن کا وجود زمانہ تاریخ کی ابتدا سے کہیں پہلے سے تھا اور اسی وجہ سے یہ خاندان اپنے آپ کو فخریہ سورج بنسی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اچھے بُرے۔ رحمدل وظالم ہر قسم کے حکمرانوں کی حکومت ان ریاستوں پر رہی لیکن عامۂ خلائق نے ان سب کو قبول کیا اور کبھی بھولے سے بھی ان کے دل میں بغاوت یا ہنگامہ آرائی کا خیال پیدا نہ ہوا۔ غالباً یہ خاندان اس وقت بھی حکمراں رہیں گے جب انگریزوں کے ہندوستان فتح کرنے کے واقعات تاریخ قدیم کی حیثیت سے مدارس آئندہ میں زیر تعلیم ہوں گے۔ ان میں سے بعض والیان ریاست جس طرح کم حیثیت و گمنام ہیں اسی طرح ان کی مالی حالت وقوت بھی کم ہے۔ ان کے قبضے میں ایک قلعہ کا کھنڈر ہے چند سو میل پہاڑ اور گھاٹی کا علاقہ ہے اور چند سو روپے اس کی آمدنی ہے اور فوج کی تو یہ حالت ہے کہ سپاہیوں کی تعداد ایک ہی ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ان کا سال بہ سال محاصل وصول کرکے اپنے آپ کو برقرار رکھنا کسی مادی قوت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ان کی حالت بعینہٖ اس درخت کی سی ہے جس کو ہوائی مناسبت اور بارش نے مستحکم کردیا ہو اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک پھیل گئی ہوں وہ گویا قدرت کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہیں اور مثل دوسرے موجودات عالم کے ہیں۔ ان کا قیام سادہ لوح راجپوت کاشتکاروں کے دل میں جس طرح آفتاب کی تابش سے جو اُن کے کھیت کو پختہ کرتی ہے یا طوفان سے جو ان کی زراعت کو برباد کرتے ہیں بغاوت کا خیال تک نہیں آتا اسی طرح ان حکمرانوں کے حقوق حکمرانی میں کبھی کلام نہیں کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اس وقت بہت سی ریاستیں ہیں جن میں سے بعض سربرآوردہ اور مشہور ہیں۔ جن کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ فوجی جانبازوں کے لئے کامیابی کا راستہ سخت دشوار گذار ہوتا ہے۔ حیدرآباد کی عظیم الشان ریاست کی بنا سلطنت دہلی کے (ایک دوراندیش) صوبہ دار دکن کی کنارہ کشی ہوئی (جس کی وجہ خاص یہ تھی کہ سیاسی مجبوریوں نے شہنشاہ دہلی کو چند بادشاہ گروں کے قابو میں کردیا تھا جن کی خیر خواہی شہنشاہ کے ساتھ مشکوک تھی) بڑودہ گوالیار

اور اندور کی مرہٹہ ریاستیں اور بھوپال کی اسلامی ریاست کا قیام گذشتہ صدی میں فوجی سرداروں کی فتحمندی کے باعث سے ہوا جن کے اسلاف گمنام اشخاص تھے اور مہاراجگان کشمیر کا وجود تو ۱۸۴۶ء میں سرکار انگریزی کی بدولت ہوا۔ اگر صورت حال میں یہ نہ ہوتی کہ ایک عجیب و نامعلوم آتش فشاں قوت ہندوستان کی نرم و اثر پذیر سرزمین کے طبقہ میں سرعت کے ساتھ پھیل کر موجودہ حالت میں پتھر کا سا ثبوت اور قیام پیدا نہ کرتی تو یہ ناممکن تھا کہ جن ریاستوں کو ان کے بانیوں نے اپنے زمانے میں دوسروں سے لے کر اپنا بنایا تھا ان پر ان کا خاندان متواتر حکومت کرتا رہتا۔ یہ قوت انگریزوں کی بڑھتی ہوئی تھی جو اٹھارہویں و انیسویں صدی کے دوران میں بتدریج بڑھتی اور قوت حاصل کرتی رہی۔ انگریزوں کی فتحمندی خواہ بہادری کی وجہ سے ہوئی یا بمصالح۔ طاقت کی بناء پر ہوئی یا چال سے لیکن ان کے حصول کامیابی میں گو بعض اوقات رکاوٹیں پیدا ہوگئیں مگر ان میں زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ ہندوستان کی تمام جنگجو قومیں یکے بعد دیگرے اس نئے اور خوفناک دشمن سے مقابل ہوئیں لیکن اس دشمن نے ان کو پسپا کر کے بالکل شکستہ کر دیا حتےٰ کہ یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ سلطنت مغلیہ کی جانشین صرف برطانوی ہی قوت ہے۔ تمام ملک میں امن و امان کا ڈنکا بج گیا اور ایسا امن قایم ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کو چھوڑ کر ۹۰ سال سے اس میں کسی قسم کا خلل اور رخنہ واقع نہیں ہوا جو نواب و راجہ انگریزوں کے عنان فرمانروائی ہاتھ میں لیتے وقت برسر حکومت تھے ان کے حقوق تسلیم کر لیئے گئے ؎

گذشتہ را صلوات! حصول ملک کے ذرایع خواہ کچھ ہی کیوں نہ اختیار کیئے گئے ہوں انگریزوں کو اس امر سے کہ کشور کشائی کا حق فاتح کو منجانب اللہ حاصل ہوتا ہے معترض ہونے یا اس بات سے انکار کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ حقِ توریث تلوار سے بھی قایم کیا جا سکتا ہے۔ بہر کیف آجکل کی دیسی یا جگزار ریاستوں کی تقسیم دو مختلف مدارج پر کی جا سکتی ہے۔ اولاً وہ جو بوجہ قدامت معزز اور اپنے اہالیان ملک کی پشت در پشت وفاداری کی وجہ سے مستحکم ہیں ثانیاً وہ جو انگریزی حکومت سے بھی زیادہ جدید اور ان کی بنیاد بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ انگریزی سلطنت کی یعنی اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھر جانے کے باعث سے وہ صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئی ہیں۔ اگر کہیں ایسا وقت

پیش آئے کہ انگریز بار حکومت سے خستہ ہو کر ہندوستان سے سفر کر جائیں اور اس کا پیش آنا ممکن ہے کیونکہ زمانے کا تغیر و تبدل سب کے لئے لازمی ہے تو اس وقت قدیم ہندو خاندان ایک طوفان عظیم میں اسی طرح محفوظ نظر آئے گا جس طرح اکثر سیلاب کے ہوا قع پر مٹی کے جھونپڑیوں والے دیہات مع اپنے آم کے باغات کے غرق شدہ قطعے میں ابھرے اور اونچے نظر آتے ہیں لیکن جدید خاندان جن کی بنیاد لڑائی اور غارتگری پر قایم ہوئی تھی اور جن کا نہ تو خون ان لوگوں سے ملا ہے جن پر وہ اکثر بہ جبر حکومت کرتے ہیں اور نہ مذہب و قوم کا اتحاد ہے اور جن کی جڑیں زمین میں گڑی نہیں ہیں ان کو اپنے مقبوضات برقرار رکھنے میں پھر تقدیر کا سامنا ہو کر اسی طرح لڑنا پڑیگا جس طرح ان کے بزرگان سلف سندھیا۔ ہل کر و گائیکواڑ کو لڑنا پڑا تھا۔

سکھوں کی حکومت کے زوال کا اصلی باعث یہ تھا کہ رنجیت سنگھ کا اقتدار شخصی تھا مگر اس کے اس اقتدار میں طاقت کا وہ ذریعہ شامل نہ تھا جو عائۂ خلایق کے دلوں میں قدیم خاندانوں کی عظمت کے باعث سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ چونکہ سکھوں ہی کی قوم سے پیدا ہوا تھا اور سکھوں کے اصول عمومیت کا ایک زندہ نتیجہ تھا اس لئے اُس کے خاندان کے بقاء کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ تھی کہ اس کے جانشینوں کو بھی اسی کی سی قابلیت و اطوار ورثے میں ملتے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے اکلوتے بیٹے کھڑک سنگھ کی بزدلی لاعلاج تھی۔ اس کا پوتا نونہال سنگھ جو واقعی ہونہار نوجوان تھا قتل کیا گیا اور اس کے بعد جو بدعملی کا دور ہوا تو اُس کے جانشین نہ اس بدعملی کو دبا سکے اور نہ اُس کو قابو میں لا سکے۔ اکثر اشخاص مہاراجہ کے فرزندی کی حیثیت سے تخت کے دعویدار ہوئے۔ لیکن مہاراجہ کی حرم سرا کے اسرار لاہور کے بازاروں میں جنس عام کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان فرزندوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا جائز اولاد ہونا سکھوں کے نزدیک ثابت ہوتا۔ اس کے بعد انگریزوں سے لڑائی ٹھنی جس میں سکھوں کی سرکردگی ایسے بے ڈھنگے پن سے ہوئی کہ گو انھوں نے نہایت مردانگی دکھائی لیکن سب بے سود ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب پر ایک غیر قوم کی فوج قابض ہو گئی۔ اس کے حصے بخرے ہو گئے اور بالآخر اس کا الحاق عمل میں آیا۔ رنجیت سنگھ نے اکثر پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی کہ نقشے پر انگریزوں کے مقبوضات کے خطوط جس سرخ رنگ میں دکھائے جاتے ہیں وہ رنگ

ستلج سے بڑھتا ہوا بیاس تک اور وہاں سے دریائے سندھ اور افغانستان کے پہاڑوں تک جا پہنچے گا۔ دنیا میں اس بادشاہی کی یادگار جو کچھ باقی رہی وہ یہ تھی کہ اس خاندان کا ایک شہزادہ جلاوطن ہو کر سینٹ جیمس کے دربار میں حاضر رہا اور وہ ناشدنی ہیرا جس کا نام کوہ نور ہے ملکۂ برطانیہ کے لوازم شاہی میں داخل ہوا ؎

قسمت کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔ اگرچہ انگریز سکھوں کے ساتھ لڑنے اور پنجاب کا الحاق کرنے کے تمام معاملے میں بالکل بے لوث تھے کیونکہ سکھ جماعت اور ان کے سرداروں کے بے انتہا جوش اور از خود رفتگی سے انگریز ان معاملات میں مجبور ہو گئے تھے تاہم اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزوں سے اس وقت مڈبھیڑ نہ ہوتی اور رنجیت سنگھ کے جانشین اس کی پالیسی پر عمل کر کے انگریزوں سے اتحاد پیدا کرتے تو بھی اگرچہ یہ جنگ تھوڑے دنوں کے لئے موقوف ضرور ہو جاتی مگر شمالی ہند کی اعلیٰ حکومت کے تصفیے کے لئے ایک نہ ایک دن باہم قوت آزمائی ضرور کرنا پڑتی۔ ستلج کے علاقے اور افغانستان کے ملک کے متعلق اختلافات و تنازعات کے بہت سے موقع تھے۔ سکھ نہایت خودسر اور تند مزاج تھے اور ساتھ ہی انگریزوں کو اپنا رعب داب برقرار رکھنا بھی ایسا ہی ضروری تھا۔ ایسی حالت میں یہ ناممکن تھا کہ یہ دو فوجی قوتیں پہلو بہ پہلو امن سے زندگی بسر کرتی رہتیں۔ انگریزوں کی آئندہ وقعت اور سکھ جماعت کے ساتھ ان کے آئندہ تعلقات کے لحاظ سے یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ چھیڑ چھاڑ اور حملے کی ابتدا لاہور کی طرف سے ہوئی اور کلکتہ سے اس کا آغاز نہ ہوا۔ انگریزوں کے ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے کارنامے میں شجاعت و مردانگی کے جوہر فتح حاصل کرنے پر تحمل اور مفتوح کے ساتھ حسن سلوک کی اعلیٰ مثالیں نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی بعض ایسے ناگفتہ بہ واقعات ہیں جو گو اس وقت کے حالات کے لحاظ سے قابل معافی متصور ہوں لیکن ایک بے رو رعایت مورخ کی نگاہ میں پسندیدگی کے قابل نہیں ہیں۔ مگر پنجاب کا الحاق ان واقعات سے نہیں ہے۔ تمام سکھ جماعت نے اس فعل کو محمود تصور کیا ان لڑائیوں میں اپنی مسلمہ بہادری اور دشمن کو سخت نقصان پہنچانے سے شکست کا خیال جو کانٹا سا کھٹکتا تھا ان کے دل سے نکل گیا۔ اور یہ لوگ ملک برطانیہ کی مشرقی ممالک کی رعایا میں سب سے زیادہ وفادار بن گئے۔ ان کی جانثاری و مردانگی اکثر موقعوں پر ثابت ہوئی اور اگر ان پر اسی دانشمندی اور ہمدردی سے حکومت جاری رہتی جیسی الحاق کے ابتدائی زمانے تک تھی تو وہ آئندہ بھی ایسے ہی رہتے جیسے اب ہیں اور وہ ہمیشہ انگریزی حکومت ہند کے تیغ و سپر بنے رہینگے ؎

باب دوم

سکھ

سکھ قوم جو زیادہ تر جاٹوں کی نسل سے ہے دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہے جو ان اضلاع کے ناموں سے موسوم ہیں جہاں وہ سکونت رکھتے ہیں۔

ان میں سے ایک کا نام مانجھا ہے اور دوسرے کا نام مالوا۔ ان دونوں کی ابتدا اور تاریخ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مانجھا باری دوآب کے جنوبی حصے کا نام ہے جو لاہور اور امرتسر کے قرب وجوار میں واقع ہے۔ باری دوآب سے مراد وہ قطعہ ہے جو دریائے راوی اور بیاس کے مابین واقع ہے۔ مانجھی سکھوں کا اطلاق بلحاظ مناسب وسعت اصطلاح کے اس تمام گروہ پر ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے وقت دریائے ستلج کے شمال میں رہتے تھے؛

مالوا[1] اس دریا کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ مذکورۂ بالا مالوا کی وسعت دہلی اور بیکانیر تک ہے۔ سکھ جو یہاں سکونت رکھتے ہیں وہ یہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ وہ یہاں نہ لوٹ مار کے لیئے آئے تھے اور نہ مانجھا سے وطن ترک کر کے یہاں آباد ہوے تھے۔ یہی لوگ مالوا سکھ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا مسلمہ پیشوا پھلکیان کا خاندان ہے جس کا سب سے بڑا قایم مقام مہاراجہ پٹیالہ ہے۔ نابھ۔ جینیڈ۔ بھادور۔ مولد۔ بدروکن۔ جیون وان۔ دیال پورا۔ لندگھریا۔ رامپور۔ کوٹ دھونا۔ کے خاندان کا اس سے قریبی اور فرید کوٹ اور کیتھل کا اس سے دور کا تعلق ہے؛

مالوا سکھوں کے آباو اجداد معمولی ہندو کاشتکار تھے جن میں سے اکثر راجپوت نسل کے تھے۔ سولھویں صدی کے وسط میں ان میں سے اکثر جیسلمیر سے ترک وطن کر کے یہاں آئے اور دہلی کی اسلامی حکومت کے زیر عاطفت امن دوست رعایا

[1] یہ وہ مالوا نہیں ہے جو دکن میں ہے یعنی وہ زرخیز حصۂ ملک جو نربدا کے شمال میں ہے اور جس کا وسطی ملک اندور ہے۔

کی حیثیت سے سکونت گزیں ہو گئے۔ سو سال کی مدت میں جس قدر مرکزی حکومت میں کمزوری ہوتی گئی ان جاٹ سکونت گزینوں کی قوت بڑھتی گئی۔ پہلے یہ لوگ مالگزار تھے یعنے بادشاہی خزانے میں لگان داخل کیا کرتے تھے اور کبھی کسی طرح اس بار سے سبکدوش ہونے کی انہوں نے کوشش نہیں کی کیونکہ کوئی سختی یا زیادتی ان پر نہیں ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ انھیں بڑی بڑی جاگیریں عطا ہونے لگیں۔ خود انھوں نے نئی بستیاں بسائیں اور اس طور پر دولتمند صاحب ثروت اور ملک میں صاحب رسوخ ہو گئے اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مالوے کے سرداروں نے ہندو مذہب کو ترک کر کے گرو گوبند کے مذہب کی پیروی اختیار کی جو اُس زمانے میں نیا نیا نکلا تھا گرو گوبند سکھوں کے گروؤں میں سب سے آخر اور سب سے زیادہ با اثر شخص تھا۔ اس کے بعد سو سال تک بد عملی کا دور رہا۔ مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت کا اندرونی کمزوری کی وجہ سے رفتہ رفتہ شیرازہ بکھر رہا تھا اور سکھ اپنے ان برائے نام مالکوں کی اس حالت سے فائدہ اٹھا کر یوماً فیوماً اقتدار و ملک حاصل کرنے لگے۔ مسلمان فرمانروا اس جدید مذہب کی ایذا رسانی پر آمادہ ہوئے لیکن اس کا استیصال نہ کر سکے۔ اس زمانے میں سکھ مذہب کے ہاتھ میں بھی بعینہ اسی طرح تلوار تھی اور وہ اسی طرح کام لیتے تھے جس طرح کہ ساتویں و آٹھویں صدی میں خود مسلمانوں اور اس صدی میں وہابیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جو لوگ سکھ مذہب میں داخل ہوتے تھے وہ آپس میں جنگ و جدال کرنے پر بھی ہر وقت اسی طرح آمادہ رہتے تھے جیسے کہ کسی عام دشمن کے مقابلے میں تیار ہوں اور یہی وہ موقع ہوتا تھا جس میں اتفاق کرنا اُن کے لیئے ممکن تھا سکھوں نے علانیہ طور پر ہندو قوانین کی پیروی کو جن پر نہیں معلوم کس زمانے سے وہ عمل کرتے چلے آرہے تھے ترک نہیں کیا اور نہ بابا نانک یا گرو گوبند نے کوئی ایسے قواعد منضبط کئے جو مراسم شادی اور تقسیم ترکہ کے متعلق ان کی رہنمائی کرتے۔ لیکن ہندو مذہب کے قیود و شروط کو وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور جہاں کہیں انھیں اپنے فوری فواید کے خلاف پاتے ان پر عمل کرنے سے قطعاً انکار کرتے۔ اس وقت کی تمدنی حالت بہت پست ہو رہی تھی۔ ہر شخص کی نظر میں جو بات اچھی معلوم ہوتی اس پر وہ کاربند ہوتا اور جس امر کے متعلق اسے یہ یقین ہوتا کہ کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہو گی وہی اس کے نزدیک ٹھیک ہوتا تھا۔ بیواؤں اور یتیموں کا کوئی دستگیر نہ تھا کہ جابر اور دل آزار ہمسایوں سے ان کو پناہ

دے۔ یہ ہمسائے ان مظلوموں کی زمینوں کو جس طرح چاہتے آپس میں بانٹ لیتے۔ چھوٹے چھوٹے سرداروں کو اپنی جائدادیں محفوظ رکھنے کے لیئے اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ بڑے بڑے خاندانوں کے محکوم اور مددگار بن جائیں اور یہ خاندان فوجی خدمت کے صلے میں اون کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں۔ غرض اس طرح ستلج اس پار کے بڑے سرداروں کا اقتدار قایم ہوا۔ گو وہ خود مجہول النسب تھے اور اُن کی جائدادیں چھینا جھپٹی کی تھیں مگر شہنشاہ دہلی پر دباؤ ڈال کر جو اسناد و خطابات انھوں نے حاصل کئے ان سے ان کے نام اور ان کی حیثیت کو بزرگی حاصل ہوگئی۔ شہنشاہ دہلی ابتک برائے نام مالوے کا فرمانروا تھا۔ مگر اس وقت حالت نہایت کمزوری و بے کسی کی تھی اور بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ان لوگوں کی بھی عزت افزائی کرے جس کو جانتا تھا کہ اُس کی سطوت وقوت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

انیسویں صدی کے شروع میں ستلج اُس پار کے سرداروں پر اب وہ بلائیں نازل ہوتی نظر آئیں جو اس سے پہلے وہ اکثر دوسروں کے سروں پر نازل کیا کرتے تھے۔ رنجیت سنگھ لاہور کے مہاراجہ نے اپنی راجدھانی کے گرد و اطراف کے تمام سرداروں کو مطیع کر لینے کے بعد یہ مصمم قصد کیا کہ ستلج کے جنوب میں دریائے جمنا تک تمام ملک فتح کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ قطعۂ ملک انگریزوں سے مڈبھیڑ ہوئے بغیر فتح ہو جائیگا۔ ستلج اُس پار کی ریاستوں کی حالت نے اس کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے پر اور بھی زیادہ آمادہ کیا آپس کے بغض وعناد اور کسی باہمی رشتۂ اتحاد کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس وقت اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوچکا تھا وہ لوگ یکے بعد دیگرے رنجیت سنگھ کے عزم و مستعدی کے ضرور شکار ہو جاتے۔ رنجیت سنگھ کی حرص کی کوئی حد نہ تھی نہ اس کو کسی جرم کے ارتکاب سے باک تھا۔ اور عزت و رحم ایسے الفاظ تھے جن سے اس کے کان قطعاً نا آشنا تھے۔

مالوا کے سردار اس خطرے سے بر وقت آگاہ ہوگئے اور عین اس وقت جب کہ ان کی بربادی میں کوئی شبہ نہ ہو سکتا تھا انھوں نے انگریزوں کے سائے میں پناہ لی۔ انکی درخواست بڑے پس وپیش کے بعد قبول کی گئی۔ اور ستلج اُس پار کے ملک کا انگریزوں کے زیر حفاظت ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد عرصے تک امن و سکون رہا۔ اس مدت میں اس قوت عظیم نے جس طرح ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا اسی طرح

اندرونی امن و عافیت برقرار رکھنے پر بہت کچھ زور دیا اور بڑی سے بڑی ریاست سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے صاحب املاک شخص کی وہی عظمت و قوت برقرار رکھی جو تحت حمایت ہونے کے وقت انھیں حاصل تھی۔ اس زمانے میں جانشینی کے قواعد میں حتی الامکان موافقت و مطابقت پیدا کی گئی۔ مگر یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ یہ اصلاحیں اس قانون کو پیش نظر رکھ کر استعمال کی گئی ہیں جس کا رواج ایک خاص نوعیت کی سوسائٹی میں تھا۔ اس سوسائٹی کو جو آزادی کو مترادف خود مختاری کا سمجھتی تھی ترتیب و تنظیم کے حرکات سے آگاہ ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔

سنہ ۱۸۴۵ - ۱۸۴۶ عیسوی والی ستلج کی فوجی مہم کا تقریباً وہی نتیجہ ہوا جو سنہ ۱۸۶۶ عیسوی میں شمالی جرمنی کی فوجی مہم کا ہوا تھا۔ انگریزی حکومت مدت سے جو حالات درپیش تھے اُن پر تاسف کر رہی تھی اور سرداروں کے ساتھ نقض معاہدہ کئے بغیر کوئی تدبیر ان حالات کی اصلاح کی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی وہ دیکھتی تھی کہ چھوٹے چھوٹے جابر سردار جن کو اپنی ریاستوں میں کامل اقتدارات حاصل تھے لوگوں پر کس درجہ ظلم و جبر کر کے پیسے ڈالتے تھے۔ ان سرداروں کی بدعقلی و ناشکری کی وجہ سے بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سرکار انگریزی کو جدید انتظام کی ابتدا کرنی پڑی۔ صرف بڑے بڑے سرداروں کا اقتدار برقرار رکھا گیا اور چھوٹے چھوٹے سرداروں کے اقتدارات بالکل سلب کر لئے گئے۔ اعلان ہو گیا کہ وہ صرف سرکار انگریزی کے جاگیردار ہیں ان کا تمام ملک سرکار انگریزی کے عہدہ داروں کے زیر حکومت اور سرکاری قوانین کے زیر اثر ہو گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالوی سرداروں کو متعدد مدارج ترقی کے طے کرنا پڑے۔ اول اُن کی حیثیت محض کاشتکاروں کی سی تھی۔ جو وطن ترک کر کے ان زمینوں پر آبسے تھے اور اُن میں کاشت کرتے تھے۔ اس کے بعد ان زمینوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ پھر اسلامی قوت سے ان کا مقابلہ رہا۔ اور اسی مقابلے کے اثناء میں قدرتی طور پر ان سرداروں کے اقتدارات بہت بڑھتے گئے۔ اس کے بعد سکون اور امن کا زمانہ آیا جس کا باعث یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے زیر حفاظت آ گئے تھے۔ سب سے آخر دور میں ان کی تعداد کثیر کے اقتدارات جنھیں وہ ناجائز طور پر کام میں لاتے تھے؛ اور جن کا انہیں حاصل ہو جانا ملک کی عین بدقسمتی تھی سلب کر لئے گئے۔

مانجھا سکھوں کی تاریخ میں اس قسم کی تدریجی ترقی کا پتہ نہیں چلتا۔ سو برس بھی نہ گذرے ہونگے کہ ان کی جماعت کے ایک بہت بڑے حصے کی حیثیت محض کاشتکاروں کی تھی اور وہ اس قسم کے مراعات سے قطعاً مستفید نہ تھی جو ستلج اُس پار کے سرداروں کو دہلی کے دربار سے مدت تک حاصل ہوتے رہے۔ احمد شاہ اور افغانوں کے آخری حملے کے ساتھ ہی انکا اقتدار بڑھ گیا اور ہر ایسا شخص جس میں کچھ مستعدی وجرات تھی لٹیروں کا ایک گروہ جمع کر کے ملک کو تاخت وتاراج کرنے لگا اور جو قطعات زمین ہاتھ لگے ان کا مالک بن بیٹھا۔ ان میں سے بہت سے سکھ ستلج اتر کر دہلی کی سرحد تک لُوٹ مار کرتے کرتے پہنچ گئے۔ جنھوں نے ستلج اُس پار کے وسیع قطعات پر قبضہ کر لیا اور بزور شمشیر ان پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ان کی روش اپنے پڑوسی مالوی سکھوں سے بالکل مختلف تھی یہ نارمن اُمرا ایسے مشابہ تھے جو سات سو سال قبل ویلز کی سرحدوں پر اقامت گزیں ہوئے تھے ؛

پنجاب میں ستلج اُس پار سکھوں کا برسر اقتدار ہونا زیادہ مدت تک نہ نبھ سکا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک ایک کر کے سب کو مغلوب کر لیا۔ رام گڑھیا۔ بھنگی۔ کنھیا سب بڑے بڑے گھرانے ایک دوسرے کے بعد مطیع ہوتے گئے۔ اور یہ نوبت پہنچ گئی کہ سرداری برائے نام رہ گئی اور لاہور کے راجہ کی مرضی پر اُس کے عدم و وجود کا انحصار تھا ؛

انبالہ۔ لدھیانہ۔ جالندھر۔ ہوشیارپور۔ امرتسر۔ لاہور۔ گرداسپور۔ گجرانوالہ۔ سیالکوٹ اور فیروزپور کے اضلاع جہاں سکھوں کی سب سے زیادہ تعداد آباد ہے پنجاب کے سب سے زیادہ آباد اضلاع ہیں۔ نظم ونسق کے لحاظ سے ہر ضلع اپنی سیاسی مالی۔ اور عدالتی کارروائیوں کے لحاظ سے ایک واحد شے کی حیثیت رکھتا ہے اور چند اضلاع مل کر عموماً تین ضلعوں کا مجموعی رقبہ جس کو قسمت کہتے ہیں نظمی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ پنجاب کی چار قسمتیں انبالہ۔ جالندھر۔ امرتسر۔ اور لاہور وہ علاقے ہیں جن میں مذکورۂ بالا تمام اضلاع جہاں سکھوں کی بودوباش ہے شامل ہیں اور اس امر کے باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ رنجیت سنگھ کے زمانے سے لے کر اب تک سکھوں کی تعداد کثیر کسی دوسرے ضلع سے ان اضلاع میں یا ان اضلاع سے کسی اور مقام پر منتقل ہوئی۔ یہ ممکن ہے کہ دیسی ریاست کے عروج ہونے پر تھوڑی مدت کے لئے سکھوں کی کوئی بڑی جماعت کسی دور دراز مقام سے امرتسر یا لاہور آگئی ہو اور ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ اب جو امن وامان اس علاقے میں قایم ہے اس کی بنیاد پر یہ

بسنے والے ان ہی مقامات پر اور مسلمانوں کی عین بستیوں میں جہاں آج سے پچاس سال قبل وہ اپنی صورت نہ دکھا سکتے تھے رہ پڑے ہوں گے - لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سکھ اکثر زراعت پیشہ ہیں اور سوائے عارضی فوجی خدمات کے وہ اپنی موروثی املاک سے جدائی گوارا نہیں کرتے - اسی وجہ سے یہ ہوا ہے کہ سکھ آبادی کی تقسیم تعداد کے لحاظ سے مختلف مقامات میں اب بھی وہی پائی جاتی ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھی۔ یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کی تعداد کتنی تھی اور پنجاب کی جملہ آبادی کے ساتھ اس کا کیا تناسب تھا کیونکہ ۱۸۵۵ء کی مردم شماری سے قبل کے اعداد و شمار کا صحیح پتہ نہیں چلتا - ۱۸۶۸ء - ۱۸۸۱ء - ۱۸۹۱ء میں بھی مردم شماری کی گئی جن میں سے اخیر سال کے اعداد کی اشاعت اب تک نہیں ہوئی - تاکہ اُس سے سابق کی تعداد کا مقابلہ ہو سکے اس امر کا دریافت کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جیسا کہ بعضوں کا خیال ہے اور ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کی تعداد میں درحقیقت کمی ہو رہی ہے یا یہ کمی محض اتفاقی و عارضی تھی - بظاہر بہت سے امور اس مسئلے کے متعلق قابل لحاظ ہیں - سکھ سے مراد مذہب ہے نہ کہ قوم - ہندو کسی قوم کا کیوں نہ ہو شاعر کی طرح مادرزاد ہندو ہوتا ہے - اس کی پیدائشی حیثیت میں کبھی فرق نہیں آتا لیکن سکھوں کی حالت بالکل اسکا عکس ہے - سکھ کی اولاد اس وقت تک سکھ نہیں ہوتی جب تک کہ وہ بالغ ہو کر اکال بنگہ یا کسی دوسرے ایسے ہی مذہبی پاک مقام پر اس مذہب میں شریک نہ کیا جائے اور مذہبی تلقین پاہل حاصل نہ کرلے - اس طور پر امیدواران شرکت کی تعداد اس امر پر موقوف ہے کہ عام لوگ شرکت کو مفید یا غیر مفید تصور کرتے ہیں - رنجیت سنگھ کے زمانے میں جب کہ مذہبی جوش اور قومی فخر ایک ساتھ کام کر رہے تھے حاکمانہ مذہب میں داخل ہونے والوں کی تعداد نسبتہً زیادہ تھی - سرکار انگریزی نے جب ۱۸۵۵ء میں اول مرتبہ مردم شماری کی اس وقت بیرونی اثر تنزل کی طرف مائل کرتا تھا - خالصہ کی قوت ایسی گری تھی کہ پھر اُس کے اُٹھنے کی اُمید نہ تھی - اس کے افراد کو جدید حکام کے مزاج سے پوری واقفیت نہ تھی اور یہ خیال تھا کہ ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے ناخوش ہوں جنھوں نے دو لڑائیوں پر مجبور کرکے زیربار کیا - اسی وجہ سے سکھوں نے سکوت اختیار کیا اپنی اولاد کی شرکت مذہب کی رسم ادا کرنے سے باز رہے کیونکہ اس وقت توقف کرکے زمانہ کا رنگ دیکھنا مناسب تھا اور

پاہل کی رسم اس کے بعد بھی ادا کی جا سکتی تھی ؛

۱۸۶۸ء کی مردم شماری کے موقع پر تعداد میں خوب اضافہ ہو گیا - غدر پھیل چکا تھا اور سکھوں نے بہ خوشی ہندوستان کے امن قایم کرنے میں اپنے فاتحین کا ساتھ دیا تھا - اُن کی شرکت شکر گذاری کے قابل اور شاندار تھی - ہندوستان میں غالباً ۱۸۵۷ء کے غدر سے زیادہ مبارک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا - اس نے ہندوستان کے افق کو تمام گرد و غبار سے پاک صاف کر دیا - اس نے اس کاہل پیٹ بھری فوج کا وجود مٹا دیا جس نے گو اپنی سو سال کی زندگی میں اکثر کارہائے نمایاں کئے تھے لیکن اب بیکار تھی - اس نے ناقابل ترقی - خود غرضانہ - اور تاجرانہ طریقۂ حکومت کے بجائے ایک بے رو رعایت اور مہذب طریقۂ حکومت کی بنا ڈال دی - اور اس نے سکھوں اور ان کے حکمرانوں کے درمیان رابطۂ اتحاد و محبت قایم کر دیا - اور ان کو ایسا بنا دیا جیسے وہ آجکل نظر آتے ہیں یعنی حکومت انگلشیہ کے سب سے بڑے معاون و مددگار بالآخر اُس نے ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ انگریزوں میں جرات اور قومی روح ایسی ہے کہ وہ مصائب کو ہیچ سمجھتے ہیں جنھوں نے کبھی یہ خیال تنگ دل میں نہ آنے دیا کہ اتفاقات جو ان کے موافق ہیں وہ شمار میں دو ہیں یا دس اور جنھوں نے ہمیشہ فتح کے وثوق کے ساتھ دھاوا کیا جب کہ کامیابی کی توقع بالکل نہ تھی - غدر کے بعد سے سکھوں نے دیکھا کہ ان کے نئے حاکم انھیں مشتبہ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان پر اعتماد کرتے اور ان کو اپنا رفیق تصور کرتے ہیں "سکھ" نام کی پھر وہی وقعت ہو گئی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھی - یہ لفظ عزت کا نشان سمجھا جانے لگا اور جو شخص اس نام سے موسوم ہوتا اس کے لئے گویا فوجی خدمات کا دروازہ کھلا ہوا تھا - اس طور پر اس مذہب کو از سر نو قوت حاصل ہو گئی اور سکھوں کی کثیر التعداد اولاد جن کی شرکت مذہب کے مراسم ملتوی رکھے گئے تھے اب انھیں پاہل دیا گیا اور جاٹوں اور ہندوؤں کی ادنیٰ اقوام سے بھی بہت سے لوگ اس مذہب میں داخل ہو کے ان میں مل گئے ؛

اس جوش و خروش کے زمانے کے بعد قدرتی طور نے پلٹا کھایا اور ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کو ۱۸۶۸ء کی مردم شماری سے مقابلہ کرنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مرکزی ضلع میں ان کی تعداد کم ہونے لگی - اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود تختوں کی ترتیب صحیح نہ تھی اور غلطی سے نانکی سکھ جو لفظ سنگھ اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کرتے دسویں گرو گوبند کے پیروؤں کے

ساتھ شامل کر لیئے گئے تھے لیکن سب سے بڑی وجہ ہندو مذہب کی زبردست کشش تھی جس نے امن کے زمانے میں جب کہ جنگجو خصلت کا اثر کم ہو جاتا ہے لوگوں کے دلوں پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ اس کی تاثیر عشق پیچے کی بیل کی سی ہے جو ایک بار اس کی گرفت میں آگیا اُسے جکڑ کے دبوچ لیا اس نے تقریباً تمام مذاہب کو جیسے سکھ اور بودھ مذہب پر دونوں ہندو مذہب کی اتحادی صورتیں تھیں جب برسر مقابلہ ہوئیں تقریباً خاتمہ کر دیا۔ مغرب میں رومی کلیسا کی جو حالت ہے وہی مشرق میں ہندو دھرم کی ہے۔ جب کہ جوار بھاٹے کی طرح اس کا جزر ہوتا ہے اور حریف مقابل اپنی فتح کا یقین کر لیتے یہ اپنی پہلی قوت کے ساتھ طوفان بنکے پلٹتا ہے۔ ہندو مذہب ہمیشہ سے سکھ مذہب کا مخالف رہا ہے کیونکہ سکھ مذہب نے اس کے اہم اصول ذات کی جو اس کی جان ہے شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور اگر یہ اصول نہ رہے تو برہمنی نظام مردہ ہو کے زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ سکھ مذہب پر ہندو مذہب کا اثر دو طریقے پر ہوتا ہے ایک تو بچوں کے پاہل کی رسم ادا کیئے جانے سے والدین کو باز رکھنا دوسرے خود اُن سکھوں کو جو ان میں شامل ہو گئے ہیں ان کے مذہب سے منحرف کرنا۔ چند رسوم بطور کفارہ ادا کرنے۔ برہمنوں کو کچھ دان دینے اور فوجی لقب کو اپنے نام سے جدا کر دینے پر سکھ پھر جاٹوں کے گروہ میں عام ہندوؤں کی حیثیت سے شامل کر لیا جا سکتا ہے۔ سکھوں میں مذہب و نام کے تبدیل نہ کرنے پر بھی جزوی معاملات میں ہندو مذہب کے اصول کی پیروی کرنے کا عام رُجحان ہے اور یہاں بھی دوسرے ممالک کی طرح عورتوں کا اثر اس معاملے میں غالب رہتا ہے ؎

ہندو عورتوں کے لیئے جو بالکل ناخواندہ ہوتی ہیں سکھ مذہب کے فلسفیانہ الٰہیات یا گرو گوبند کی سیاسی تعلیم ہندو مذہب کی بت پرستی کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور ان کی سمجھ سے مناسبت رکھتی ہے اور وہ ان کی مذہبی رسوم کی رنگ آمیزی کر کے جان ڈالتی ہے جو سری گرنتھ کے منتروں کی جاپ سے ممکن نہیں۔ ہندو دھرم کی رسمیں ادا کرنے کے لیئے وہ اپنے گاؤں کی ہجولیوں میں ہل مل کے باہر جاتی ہیں اور صبح کو مندر یا ان پتھروں پر جن کو سیندور لگا یا ہے جہاں ٹھاکر جی کا استھان ہے جو گاؤں کے نگہبان ہیں۔ ہندو دھرم کے سیکڑوں تہوار منانا دیول کا جانا ایک ہنگامہ جوش خروش اچھے اچھے کپڑے پہننا ان عورتوں کا دل بہلاوے ہیں ورنہ ان کی زندگی نہایت اُداس اور ایک ہی حالت

پر رہتی ہے ــــ ہے دم اُکتا جاتا ہے۔ صرف مذہب ہی کی آڑ میں انکی زندگی نرمی سے کٹتی ہے
ان عورتوں کا ہندو اور سکھ مذہب کا فرق سمجھ کے اسے قبول کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی
انگریز عورت کا ناچ کا جلسہ چھوڑکے کویکر فرقے کی رہبانیت کو پسند کرنا علاوہ بریں پروہت
کا اثر خواہ وہ کیتھلک مذہب کا ہو یا برہمن عورتوں پر مردوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔
اس زندگی کی خوشحالی اور مرنے کے بعد مکت اس کا انحصار گُروکی ذات پر ہے۔ برہمن پنڈت
اولاد کی امید دلانے میں وعدہ کرتے ہیں کہ سوت کی پریت اوس کے سوامی کو نہ موہ سکیگی۔
ہندو دھرم کی رسموں کے بجالانے پر اُس کی آئندہ بھلائی کا ذمہ ہے۔ مرد بھی انھیں
خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے برہمنی مذہب کی روایتیں ایسی قوی ہیں کہ
جدید اصلاح ان کو روک نہیں سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ پھر ہندو مذہب میں پلٹ
کے آجاتے ہیں۔ سکھ گو تمباکو نہ پیئے اور ڈاڑھی یا سر کے بال نہ کترواے مگر پھر بھی برہمن
کی عظمت اور اپنی قدیم مذہب کی دیویوں میں حاضر ہو کے ہندوؤں کی وہم پرستی کے
رسوم بجالاتا ہے۔ ذات پات کے بارے میں سکھوں نے بہت کچھ اپنی آزادی برقرار رکھی
ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو وہ عیسائی یا مسلمان کے برتنوں میں کھا بھی سکتا ہے۔ مگر وہ کبھی
ایسی ذات والوں کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا جسے ہندو لوگ ناپاک تصور کرتے ہیں۔
خاکروب یا مزبی سکھ جن کی تعداد کثیر ہے (کیونکہ ظاہر ہے سکھ مذہب زیادہ تر نیچ ذات
والوں کے لئے زیادہ دلکش رہا ہے) سکھوں کے مندروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔
سرکار انگریزی نے مجبوراً اس ذات والوں کے لئے جو اپنی اعلیٰ ذات والے ہم مذہبوں
سے لڑائی کے موقعے پر بہادری میں کم نہ رہے ۔

تعجب ہے کہ خالصہ کے زمانہ انتہاے عروج میں بھی پنجاب کی آبادی میں بہت
کم تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے سکھ مذہب قبول کیا۔ اس صدی کے ابتدائی
زمانے کے مجنونانہ غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانۂ مابعد میں مہاراجہ نے ایک بے مثل فوجی
جماعت قایم کرلی اور ان لوگوں نے جو شمار میں ہندوؤں کی ایک ذات والوں کی تعداد
سے زیادہ نہ تھے یکجہت ہو کر تمام پنجاب و کشمیر کو تاخت و تاراج کیا۔ افغانوں کو شکست
دے کر ان کو کوہستان میں واپس بھیجدیا۔ اور ایک زبردست سلطنت قایم کردی جس
میں تعداد کی مناسبت ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں ایک و دس کی تھی ؎

پنجاب کی مردم شماری باستثناء کشمیر ۱۸۸۱ء میں ۲ کرور، ۲۷ لاکھ ۱۲ ہزار ۱۲۰ تھی جس میں سے ایک کرور ۱۶ لاکھ ۶۲ ہزار چار سو چونتیس مسلمان۔ ۹۲ لاکھ ۳۲ ہزار دو سو پچانوے ہندو اور ۱۷ لاکھ ۱۶ ہزار ایک سو چودہ سکھ تھے۔ صرف انگریزی علاقے میں ہر دس ہزار کی عام آبادی میں ۵۹۵ سکھ یعنے ۱۸۶۸ء کی مردم شماری کے مقابلے میں جب کہ تعداد ۶۵۰ تھی ہر دس ہزار میں ۵۵ کی کمی واقع ہوئی۔ جن اضلاع میں سکھوں کی آبادی نسبتہً زیادہ ہے وہ فیروزپور۔ امرتسر اور لدھیانہ ہیں۔ فیروزپور میں دس ہزار آبادی میں ۲ ہزار پانسو پچانوے۔ امرتسر میں دو ہزار چار سو بائیس اور لدھیانہ میں ۲ ہزار پچپن کی تعداد ہے اگرچہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں کی آبادی نسبتہً زیادہ ہو لیکن غالباً وہ وسطی اضلاع میں زیادہ تعداد میں مجتمع تھی اور خالصہ کے زمانۂ عروج میں بھی ان کی تعداد کبھی ۲۰ لاکھ[1] سے زیادہ نہ تھی۔

دیسی ریاستوں میں پنجاب کی تمام سکھ آبادی کا ایک ثلث سکونت رکھتا ہے۔ قدرتی طور پر پٹیالہ سب سے بڑھا ہوا ہے عام آبادی کی نسبت سے وہاں ہر دس ہزار میں دو ہزار سات سو اکاسی سکھ ہیں۔ ذات کے لحاظ سے ان کی تقسیم کا مسئلہ بہت دلچسپ ہے لیکن گزشتہ مردم شماری سے پہلے کبھی ٹھیک تعداد معلوم کرنےکی کوشش نہیں کی گئی اب معلوم ہوا کہ اس صوبے کی مختلف قسموں میں ایک ہزار سکھوں میں سے چھ سو ننانوے جاٹ راجپوت سینس اور کمبوہوں کی زراعت پیشہ ذات کے ہیں ستلج کے جنوبی اضلاع میں اس تعداد میں نسبتہً زیادتی ہے۔ اور وہ بنیئے اور کھتری کی تجارت پیشہ ذاتوں میں ان کی تعداد ۷۴ فی ہزار ہے اور کمہار۔ بافندے۔ لوہار۔ نجار۔ سنار۔ حجام اور اسی قسم کی اہل حرفہ ذاتوں میں ان کی تعداد ۱۳۴ فی ہزار ہے اور دوسری نیچ ذاتوں میں ۹۵ فی ہزار سکھ پائے جاتے ہیں۔ سکھوں کے اہل حرفہ کی ذات کے لوگ تمام اضلاع میں یکساں نسبت سے پائے جاتے ہیں لیکن تجارت پیشہ سکھ مسلمانوں کے اضلاع میں زیادہ آباد ہیں۔ ان میں سے بعض مثلاً راولپنڈی کی قسمت میں ہی لوگ

---

[1] ایک تار برقی ہندوستان سے ۲۰ فروری ۱۸۹۴ء سکھ آبادی کی تعداد ۱۸۹۱ء کی مردم شماری ۱،۹۰۷،۸۳۳ کل نفوس تمام ملک میں بتاتی ہے۔

سکھ آبادی کا ایک بہت بڑا جزو ہیں۔ مذہبی ذاتوں برہمن اور فقراء میں ان کی تعداد بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ پنجاب کے تمام سکھوں میں ۴ فی ہزار پروہتوں کی جماعت میں شامل ہیں سکھوں کا ماخذ زیادہ تر جاٹ ہیں۔ اس ذات کی تقسیم در تقسیم بہت سے فرقوں اور قبیلوں میں ہے اور پنجاب کی تمام ذاتوں میں یہی ذات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ جاٹوں کی اصلیت اب تک کماحقہ دریافت نہیں ہوئی ہے اور اس پر بہت کچھ مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ بعض مشہور مورخین نے انکا گیڈک نسل سے ہونا بیان کیا ہے لیکن پنجاب کے جاٹوں کی روایتوں کے لحاظ سے ان کے تمام فرقے دراصل راجپوت نسل سے ہیں اور انھوں نے وسط ہند سے پنجاب میں آکر سکونت اختیار کی تھی۔ سندھو اور وراچ جاٹ بھی جو دریائے سندھ کے پار کے باشندوں کی نسل سے ہونے کا دعوے کرتے ہیں اپنی اصلیت کے بارے میں متفق الرائے نہیں ہیں اور دونوں فرقوں کے کثیر افراد راجپوتانے کو اپنا قدیم وطن بتاتے ہیں۔ دریائے سندھ کے مغرب سے اور کسی قوم کے نقل مکان کرکے آنے کا تاریخ سے پتہ نہیں چلتا صرف سندھو اور وراچ کے بانیوں ہی کے تبدیل وطن کرنے کا پتہ چلتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے علیحدہ وطن ترک کرکے یہاں آباد ہوئے ہیں۔ پنجاب کے جاٹوں کی زبان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ان کے گیٹک نسل سے ہونے کی تائید ہو سکے۔ اس مضمون کے متعلق خود میری ذاتی تحقیقات نے جو کسی زمانے میں بہت وسیع تھی مجھے اس امر کا یقین دلایا اور مسٹر ایبٹسن مردم شماری کی رپورٹ کے مولف بھی میری اس رائے سے متفق ہیں کہ جاٹ و راجپوت عموماً ایک ہی نسل سے ہیں اور موجودہ امتیاز صرف تمدنی معاشرت کی حیثیت سے ہے نہ کہ بلحاظ تقسیم اقوام۔ جاٹ تعداد میں راجپوتوں سے تگنے ہیں اور ان کی فوجی قابلیت عمدہ کاشتکار محنتی دیانتدار اور فرمانبرداری کے لحاظ سے وہ پنجاب کی اقوام میں قابل قدر و اہم فرقہ تصور کئے جاتے ہیں یہ لوگ اپنے طور طریقوں میں بالکل آزاد ہیں اور بجائے جماعت یا گروہ کے زیر اثر ہونے کے بہ نسبت اور اقوام کے وہ بہ شدت شخصی آزادی کے حامی ہیں۔ گو وہ موقع پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن فطرتاً وہ ظالم و کینہ پرور نہیں ہیں اور امن کے زمانے میں عمدہ رعایا اور لگان ادا کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ وہ صبر و استقلال و کامیابی کے ساتھ اپنا پیشہ زراعت انجام

دیتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں برہمن ۔ راجپوت اور کھتریوں کے بعد ان کا مرتبہ تصور کیا جاتا ہے لیکن وہ خود اپنے آپ کو راجپوتوں کے مساوی اور کھتریوں سے بالاتر شمار کرتے ہیں اور گزشتہ واقعات و موجودہ حالات کے لحاظ سے ان کا یہ دعوے قابل قبول بھی ہے۔ دریائے بیاس وستلج کے قرب وجوار کے اضلاع میں جہاں سکھ سکونت گزین ہیں یہ لوگ سب سے اچھی حالت میں نظر آتے ہیں۔ جنوبی اور سرحدی اضلاع میں ان کی حالت جداگانہ ہے۔ اکثر حالتوں میں ان کی اصلیت راجپوت نسل سے علیحدہ ایک اور قوم معلوم ہوتی ہے ؎

اس طور پر سکھوں کی خوبیاں اور جاٹوں کی خوبیاں ایک ہی شی ہیں۔ کیونکہ سکھ اسی قوم کے لوگ ہیں ۔ نئے مذہب نے ان میں ایک فوجی جذبہ پیدا کردیا ہے جو اس مذہب کی خاص روایات میں سے ہے اور سرکار انگریزی کو ان کے اس جذبے کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اب چونکہ سرکار انگریزی کا اقتدار ہندوستان میں یکسوئی حاصل کرچکا ہے اور سال بہ سال اس کی مزاحمت میں انحطاط ہوتا جارہا ہے تو لازمی طور پر فوجی اقوام کو اپنے فوجی جذبات کے اظہار کا کم موقع ملتا ہے ۔ ہر جگہ سپاہی کاشتکاری کے کام میں مصروف ہوتے جاتے ہیں ۔ یہ لوگ تلوار کو کوٹ پیٹ کر ہل کی نوک بنا لیتے ہیں اور اب ہمیں اس امر کا فخر ہے کہ سرکار انگریزی کی جے پکاری جاتی ہے گویا کہ تمام ملکی نظم ونسق کی کامیابی کا دارومدار وانحصار امن پر تھا۔ لیکن ہندوستان جیسی سلطنت کے لئے جس کی آبادی اٹھائیس کروڑ اسی لاکھ ہے جس کو بہت سے بیرونی خطرات کا اندیشہ ہے اور جس کی تاک میں دشمن لگے رہتے ہیں اس کی سلامتی کے لئے لڑائی اشد ضروری ہے ۔ تلوار ہمیشہ تیز رکھنا چاہیئے اور زیادہ عرصے تک اس کو نیام میں رکھ کر زنگ آلودنہ ہونے دینا چاہیئے ۔ اگر ہندوستان کے حکمران واقعی دانشمند ہیں تو وہ سکھوں کی فوجی خدمات کو برقرار رکھنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے رہیں گے اور ہر موقع پر انھیں مصروف کار رکھینگے خواہ جنگ یورپ میں ہو یا ایشیا یا افریقہ میں۔ سب سے بڑی ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ ان کو اس قسم کی فوجی تربیت دی جائے کہ وہ ہر طرح کے دشمن کی مدافعت کرنے کے قابل ہوں خواہ دشمن یوروپین اقوام سے ہو یا ایشیائی ۔ انگریزی فوج کی تعداد

اس درجہ کم اور اس کی نظم و ترتیب ایسی ناقص ہے کہ ہندوستان کو بظاہر بیرونی حملوں کی مدافعت کے لئے خود ہی ہر حالت میں تیار رہنا چاہئے اور اس غرض کے لئے پنجاب کی جنگجو اقوام خصوصاً سکھ کافی ہیں بشرطیکہ ان کی محفوظ فوج مصیبت پڑنے سے پہلے مرتّب کر لی جائے اور اس امر کا خیال رکھا جائے کہ ان کے فوجی جذبات بالکل مردہ نہ ہو جائیں ؂

(سکھوں سے تکلیف مالایطاق کی توقع رکھنا بالکل بے سود ہے۔ سرکار انگریزی کے تحت میں ان کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ غدر کے موقع پر ہو چکا ہے جب کہ این ڑو و آنزوے ستلج کے راجاؤں پٹیالہ۔ نابہ۔ جنید اور کپورتھلہ نے ہنگامے کی خبر پاتے ہی بغیر اس امر کا انتظار کئے کہ یہ شگون نیک ہے یا بد اپنی فوجوں کے ساتھ دہلی کی طرف سلطنت انگریزی کے دشمنوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کی اس بہادرانہ مثال کی تقلید تمام صوبے کے سکھوں نے کی اور ہندوستان کا ملک ملکۂ معظمہ کے لئے جس طرح انگریزی سپاہ کی سنگینوں سے حاصل ہوا اسی طرح پنجابی رعایا کی سرگرمی و وفاداری سے۔ لیکن سکھ کسی عہدے پر یا میونسپل کمیٹیوں میں کام کرنے کے لئے بالکل موزوں نہیں۔ اس امر کے ثبوت کا ذکر آگے چل کر رنجیت سنگھ کے انتخاب وزراء کے واقعات بیان کرنے کے موقع پر ہوگا۔ اسکول اور کالجوں میں بھی سکھ طلباء دوسری اقوام کے تمام طلباء سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن مشرق میں علمی مدارج کی کامیابی کسی عہدے کے لئے موزونیت کا معیار تصور نہیں کی جاتی۔ خوشامدی اور منکسر المزاج بنگالی مقابلے میں غالباً اس سے بازی لے جائیگا حالانکہ نہ تو اس میں لڑنے کے لئے جسمانی طاقت اور نہ حکومت کرنے کے لئے اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ جو لوگ جاٹ سکھوں کی کارآمد رعایا کی حیثیت سے اس بنا پر قدر نہیں کرتے کہ وہ اپنی موروثی خصلت و تربیت کے باعث تحصیل علم کی جانب رجحان کرنے سے قاصر ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ سکھ ایک جنگجو قوم ہے اور ان کے اعلیٰ اوصاف کا اظہار فوج میں ہو سکتا ہے جو ان کا قدرتی پیشہ ہے۔ وہ بہادر اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی مغلوبیت کا احساس فطرتی طور پر کم ہے۔ ضبط و تربیت کے بشدت پابند۔ اپنے افسروں کے ساتھ وفادارانہ سلوک کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ انھیں ذات پات کی پروا نہیں

ہوتی جس کی وجہ سے اکثر ہندو افواج میں انتظام برقرار رکھنے اور بہنگام جنگ ان کے خور و نوش کا بندوبست کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق میں تمام دوسری اقوام پر سپاہی کی حیثیت سے انھیں فوقیت حاصل ہے۔ ملکۂ معظمہ کی رعایا میں اور بہت سی جنگجو اقوام ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان سب میں سکھ سب پر قابل اعتماد اور کارآمد سپاہی ہونے کی حیثیت سے سبقت لے گئے ہیں۔ گورکھا بھی انھیں کی طرح بہادر اور میدان جنگ میں جانباز ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کی تعداد بہت کم ہے اور سرکار انگریزی کے علاقے میں یہ لوگ زیادہ تعداد میں سکونت نہیں رکھتے۔ ان میں سے اکثر نیپال کے باشندے ہیں اور بعض اوقات حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ فوج میں بھرتی کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کے افراد کافی تعداد میں دستیاب نہیں ہوتے ہیں

راجپوت اعلیٰ درجے کے سپاہی ہوتے ہیں گو سکھوں کا سا ان کا جسم وجثہ نہیں ہوتا۔ لیکن اعلیٰ درجے کے راجپوت دستیاب ہونا دشوار ہے اور جو لوگ ہماری سلک ملازمت میں داخل ہوتے ہیں وہ اکثر مخلوط النسل پہاڑی ڈوگرے ہوتے ہیں جن کو وسط ہند کے نجیب الاصل راجپوت نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اعلیٰ درجے کے لوگ ہماری فوج میں اس وقت تک شریک نہ ہوں گے جب تک انھیں ذات والوں کو ان کی فوج کا عہدہ دار مامور کرنے کا کوئی انتظام نہ ہو پنجابی مسلمان۔ گکھڑ۔ اوان اور توانا اقوام کے لوگ نیز شمالی مغربی سرحد کے افغان جرگے بہادر سپاہی تو ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں عرصے تک میدان جنگ میں مصروف رکھا جائے تو انھیں گھر کی یاد ستاتی ہے اور اکثر کو توسرحد پر مجبور کرنے کی ترغیب دینا ناممکن ہے۔ اور ہر حالت میں ان کوہستانی اقوام کے لوگ طبعاً اس قدر آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں کہ ان کو تہذیب و تمدن کی پابندیوں میں جکڑنا ناممکن ہے۔ وہ یہ مصیبت نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن سکھ ہر حال میں یکساں ہے دیس و پردیس جنگ و امن ہر حالت میں شاد و خوش رہتا ہے جیسا وہ مستحکم سوار ہے ویسا ہی مستقل پیادہ اور گولیوں کی بوچھار میں وہ ایسا ہی مستقل مزاج رہتا ہے جیسا کہ حملہ کرنے کے لئے وہ بے صبری ظاہر کرتا ہے۔ دیسی افواج میں صرف سکھ ہی ایسے ہیں جو تعداد کثیر میں ملک سے باہر عرصہ دراز تک

مصروف بیکار رکھے جاسکتے ہیں بشرطیکہ انھیں معقول مشاہرہ دیا جائے کیونکہ اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کی طرح وہ بھی روپے کی قدر وقیمت سے بہ خوبی آشنا اور اس کے جمع کرنے کے دلدادہ ہیں۔ انھوں نے مصر، حبش، افغانستان اور چین میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ انھوں نے برضاء و رغبت برما میں پولیس اور مقامی فوجی دستے میں ملازمت اختیار کی حالانکہ یہ ملک ایسا ہے جسے عام طور پر اہل ہند ناپسند کرتے ہیں۔ ہانگ کانگ میں بھی سکھوں کا پولیس کا ایک دستہ ہے اور وہاں ان کی بہت کچھ وقعت ہے اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ مسٹر جانسٹن کے ساتھ جو سرکار انگریزی کے ایجنٹ جنرل اور نیاسا جھیل پر عرب بردہ فروشوں سے برسرپیکار تھے سکھوں کی ایک جماعت محافظ دستے کی حیثیت سے مامور تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ سنجیدہ اور باوقعت اور مطیع اشخاص جو اب ہماری فوجوں میں شامل ہیں انھیں لوگوں کی نسل سے ہیں جو وحشی لٹیرے تھے اور سو سال قبل شمالی ہند میں ان کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔ لیکن یہ تبدیلی ایک طاقتور اور مہربان حکومت کی بدولت نیز اس فوجی تربیت کی وجہ سے واقع ہوئی جو ہمدرد عہدہ داروں کی زیر نگرانی عمل میں آئی جنگی اہل فوج وقعت کرتے اور ان سے مالوف و مانوس تھے۔ افغانستان کی لڑائی کے آخر زمانے میں مجھے سکھ فوج کے طور طریق دیکھنے کے بہت سے موقعے دستیاب ہوئے۔ ان کے مصائب پر صبر و تحمل کرنے اور افغانوں کے ساتھ جو ان کے قدیم جانی دشمن تھے پسندیدہ قواعد کی پابندی کے متعلق ان کی جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے۔

اس امر کا تصفیہ آئندہ موقع پر ہوسکیگا کہ یوروپین اقوام کے مقابلے میں ان کی فوجی خدمات کس درجہ مفید و کارآمد ہوسکتی ہیں۔ مجھے اس امر کا پورا یقین ہے اور میرے اس خیال سے ہندوستان کی افواج کے اکثر ذی وقعت عہدہ دار متفق ہیں کہ سکھوں کی پیدل اور سوار فوج اگر انگریز عہدہ داروں کے زیر نگرانی دشمن کے مقابلے پر لائی جائے تو دنیا کی ہر فوج کے ہم پایہ اور اپنے حریف مقابل سے بہتر ثابت ہوگی۔

باب سوم

سکھوں کی مذہبی حکومت

مہاراجہ رنجیت سنگھ سکھوں کی مذہبی حکومت کا ایسا کامل نتیجہ تھا اور اس میں خالصہ کی روح اس درجہ سمائی ہوئی تھی کہ اس کی طبیعت اور کردار کا بیان ہرگز پورا نہیں ہوسکتا جب تک اس مذہبی نظام کا تفصیلی بیان نہ کیا جائے جس نے پنجاب کے جاٹ کاشتکاروں پر اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نصف اول میں بہت قوی اثر کیا تھا۔ یہ مضمون اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے کہ بیان اس کا تفصیل کے ساتھ تو کب بلکہ اس کا خلاصہ بھی قابل اطمینان انداز سے نہیں ہوسکتا۔ جن لوگوں کو سکھوں کے اصول عقاید اور اخلاق سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنا ہو، چاہئے کہ ادی گرنتھ یا سکھوں کے مذہبی نوشتے کا ترجمہ اصل گرمکھی سے مع افتتاحی مضامین ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ رلس پروفیسر السنۂ مشرقیہ میونخ یونیورسٹی ملاحظہ کریں۔ ڈاکٹر موصوف کو ۱۸۷۰ء میں سکرٹری آف اسٹیٹ نے یہ اہم کام تفویض کیا تھا۔ جب ڈاکٹر ٹرمپ اس خدمت کے انجام دینے میں مصروف تھے میں گورنمنٹ کے چیف سکرٹری کے عہدے پر لاہور میں تھا۔ یہ کام سخت مشکل تھا لیکن ان کے شوق محنت اور تبحّر علمی نے اس کو پورا کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ سکھوں کے گرُو اور گرنتھی (جو ان نوشتوں کے پڑھنے اور بیان کرنے والے ہوتے ہیں) اپنے مذہب کے اصول سے ناواقف اور قدیم گرمکھی زبان کی ترکیب اور محاورات سے ناآشنا ہیں اور مشتبہ مقامات کا جو مطلب بیان کرتے ہیں وہ بھی ایسا ہوتا ہے جو مدت سے اُن میں سینہ بسینہ چلا آیا ہے اور جو گرنتھ کے دیگر مقامات سے اختلاف بھی رکھتا ہے۔ بہرکیف چند نادرالوجود شرحوں کو دستیاب کرنے کے بعد جو اصل کتاب کی مثل نامکمل اور مشکل تھیں ڈاکٹر ٹرمپ صاحب نے کسی طرح اپنا کام ختم کیا۔ لیکن اس سے پہلے ان کو ایک مجموعہ لغات اور صرف ونحو خاص گرنتھ کے متعلق تیار کرنا پڑا جس میں

گرنکھی کی ترکیبیں اور متروک الفاظ درج کئے۔ اس کام کو اوٹھانے میں جو جو مشکلات پیدا ہوئیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی حل نہ ہوں گی چنانچہ نوبت بہ این جا رسید کہ ڈاکٹر موصوف باوجود میرے سخت اصرار کے لاہور چھوڑ کر جرمنی روانہ ہو گئے اور وہاں سات برس کی مسلسل کوشش کے بعد اُن کا ترجمہ شایع ہوا۔ گو یہ ترجمہ عام طور پر دلچسپ نہیں ہوسکتا لیکن وہ ہمیشہ ایک عالم کی جانفشانی اور علمیت کی یادگار رہیگا۔ اس سے پہلے سکھ مذہب کے حالات کپتان جوزف کننگ ہم یا مسٹر ایچ ایچ ولسن نے اپنی کتابوں میں جو ہندووں کے مذہبی فرقوں کے بیان میں ہیں لکھے تھے۔ مگر یہ حالات بہت کم اور ناقص طور پر بیان ہوئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لکھنے والے خود کوئی علم سکھوں کی مذہبی کتابوں یا اون کی شرحوں کا نہ رکھتے تھے۔ بلکہ یہ بات تو ابتک آسان نہیں ہوئی ہے کہ ادی گرنتھ کی پیچیدہ و مشکل عبارت میں اصول عقاید کا جو نازک سلسلہ ایک سرے سے دوسرے تک چلا گیا ہے وہ پڑھنے والے کی نظر سے غائب نہ ہونے پاوے۔ ادی گرنتھ میں اکثر معمولی امور کس کس اختلاف سے بار بار بیان ہوئے ہیں اگرچہ اُس کے بعض حصے جن میں بھگت کبیر اور بھگت فرید کے اشلوک جو گرنتھ میں بطور ضمیمے کے اضافہ ہوئے ہیں ایسے ہیں کہ اُن کے اکثر فقروں کی عبارت دل آویز اور خوشنما ہے اور گو ان پر شعر کا اطلاق صحیح نہیں ہوسکتا تاہم ان میں شعر کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کا انداز زیادہ تر والٹ وٹمین امریکہ کے شاعر کے کلام کا سا ہے اور اس کے کلام سے ان کا مقابلہ مناسب ہے؀

ادی گرنتھ کی خاص سند بابا نانک تک پہنچتی ہے جو سکھ مذہب کے بانی تھے اور جنھوں نے سترھویں صدی کے اوایل میں اس کے اکثر مقامات تصنیف کئے۔ گرو ارجن نے جو سکھوں کا پانچواں گرو یا بڑا اوتار مانا جاتا ہے اسے موجودہ صورت میں مرتب کیا۔ اس نے نانک کی تحریر کے ساتھ اس کے جانشینوں اور دوسرے قدیم ہندو متصوفین کی تحریریں اضافہ کیں۔ سکھوں کے مابعد کے فوجی و ملکی دستور العمل کے حصر و ضبط کی حیثیت سے ادھی گرنتھ سے زیادہ گرو گوبند کی تحریریں اہم تصور کی جاتی ہیں جو سکھوں کے دسویں اور سب سے بڑے گرو مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے سنہ ۱۶۹۶ء میں ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس میں کچھ تو خود اُن کی

ذاتی تصنیفات ہیں اور کچھ ان ہندی شعرا کی مدد سے تحریر کیا گیا ہے جو اُن کے حاشیہ نشین تھے۔ اس میں قدیم متروک الاستعمال اور نہایت مشکل ہندی زبان میں اس نئے مذہب کے اصول بیان کئے گئے تھے جس کی گرو گوبند تبلیغ کرتے تھے۔ گرو گوبند نے نانک کے صوفیانہ مشرب میں کسی خاص قسم کی تبدیلی نہیں کی اگرچہ اُن کی تعلیم اور عمل صریحاً ہمہ اوست کے اصول پر رہا۔ وہ خود دُرگا دیوی کی پوجا کرتے رہے اور ہندوؤں کے دوسرے معمولی بتوں کی پرستش جائز رکھتے تھے گو وہ خدائے تعالیٰ کی ذاتِ واحد کی عبادت کو مرجح سمجھنے کے بھی حامی تھے۔

اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ دسوں گروؤں کے حالات مفصل قلمبند کئے جاسکیں۔ ان کے متعلق جو کچھ بیان کرنا ضرور ہے وہ چند ہی اوراق میں تحریر ہو سکتا ہے۔

نانک جو اس مذہب کا بانی تھا اس کی معتبر سوانح عمری "جنم ساکھی" ڈاکٹر ٹرمپ نے انڈیا آفس کے کتب خانے سے ڈھونڈ نکالی۔ یہ سوانح عمری ایچ ٹی کولبرک نے انڈیا آفس کو نذر کی تھی۔ نانک سنہ ۱۴۶۹ء میں موضع تلمونڈی میں پیدا ہوا تھا جو بعد میں ننکانہ کے نام سے گرو کے نام پر مشہور ہوا۔ یہ موضع شہر لاہور کے قریب دریائے راوی کے کنارے پر واقع ہے۔ وہ کھتری یا تجارت پیشہ ذات کا تھا اور گانوں کے معزز عہدہ پٹوارگری یا محاسبی پر مامور تھا۔ اس کے بچپن اور جوانی کے متعلق جیسا کہ ہر ایک کثرت سے پھیلنے والے مذہب کے بانیوں کے متعلق ہوتا آیا ہے عجیب عجیب خوارق عادات کے قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی عام لوگوں کی طرح کی تھی۔ اس نے شادی بھی کی اور بچے بھی ہوئے۔ ایک روز وہ دریا میں اشنان کرنے جا رہا تھا کہ فرشتے اسے اٹھا کر خدا کے حضور میں لے گئے جہاں اسے پیشین گوئی کی قدرت عطا فرمائی گئی اور روئے زمین پر خدائے واحد کے متعلق دنیا میں منادی کا حکم ہوا۔ اس خدائی حکم کی پابندی میں نانک نے بیوی بچوں کو خیرباد کہکر صرف ایک چیلے کے ساتھ جس کا نام مردانہ تھا وطن ترک کیا اور فقیرانہ لباس اختیار کر کے دنیا میں اس نئے مذہب کی تعلیم دینے کے لئے شہر بہ شہر پھرنا شروع کیا۔ سکھ

وقائع نویسوں نے اس کے مشرق ومغرب شمال وجنوب اور ایک ایسے فرضی ملک کے سفر کے واقعات تحریر کئے ہیں جس کو وہ گورک ہتری کہتے ہیں - جو ہندوستان میں گویا یوٹوپیا کی مثال ہے - لیکن ان سفروں میں جن میں بہت سے ناقابل یقین عجائبات کا وقوع بیان کیا جاتا ہے - کوئی ایسا اہم واقعہ بجز اس کے نہیں کہ اس بڑے گرو کی ملاقات شاہ بابر سے ہوئی اور وہ بہت مہربانی اور اخلاق سے پیش آیا - اس زندہ دل ذی شان فرمانروا کا حال جس حد تک ہم کو معلوم ہے اُس سے یہ کچھ بعید نہیں - اپنی عمر کے آخری زمانے میں بابا نانک اپنے خاندان کے لوگوں کے پاس جالندھر کے قریب موضع کرتارپور میں واپس آگیا اور ۱۵۳۸ء میں اس کی وفات ہوئی - اس کی زندگی میں کوئی اہم واقعات پیش نہیں آئے - اس کا طرز زندگی عام ہندو سادھوؤں کا سا تھا اور اس کا جو اثر ہوا وہ ان تحریرات میں مدوّن کیا گیا ہے جو اس کے بعد یکجا کی گئیں اس نے اپنے دونوں بیٹوں پر فوقیت دے کر اپنے چیلے انگد کو اپنا جانشین مقرر کیا - لفظ سکھ جس کے لغوی معنی نوآموز اور مرید کے ہیں نانک نے اپنے مریدوں کو بخشا اور جسقدر اس مذہب کی اشاعت ہوتی گئی اوسیقدر یہ تمام قوم کا امتیازی خطاب ہوگیا - لیکن یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ سکھ سے مراد مذہبی جماعت ہے نہ کہ کوئی خاص ذات اور اس کا اطلاق صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو خالصہ مذہب کے پیرو ہیں ؂

ارجن (پانچویں گرو نے) نانک کی تحریرات یکجا جمع کیں اور انھیں کے ساتھ مقبول عام پاک بزرگ اشخاص وشعرا کے کلام کے اقتباسات بھی اضافہ کئے - یہ کتاب سنسکرت زبان میں ہندوؤں کے ویدوں پرانوں کی طرح تحریر نہیں کی گئی جس کا عام طور پر سمجھنا دشوار ہے بلکہ پنجابی زبان میں لکھی گئی جو عام بول چال کی زبان تھی - ادھی گرنتھ ایک ہی اسلوب پر نہیں لکھی گئی - اس کے محاورات مضامین کے زمانے اور مقامات کے لحاظ سے مختلف ہیں قدیم ہندی زبان کے ذخیرے کے لحاظ سے یہ کتاب بہت زیادہ قابل قدر ہے - بابا نانک اور اس کے جانشینوں کی زبان اس وقت کی مروجہ پنجابی زبان کے لحاظ سے جس میں نانک کی جنم ساکھی لکھی گئی فصیح پنجابی زبان میں نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی ہندی ترکیبیں اور الفاظ ہیں -

غالباً مقصود یہ تھا کہ مقامی زبان کو روزمرّہ کی بول چال کی بہ نسبت زیادہ باوقعت بنایا جائے اور اس کے ساتھ یہ صفت بھی قایم رہے کہ عام فہم ہو۔ گُرو گوبند سنگھ کی تحریرات تقریباً بالکل خالص ہندی میں ہیں اور اس صورت میں فی زماننا پنجابی بولنے والے سکھوں کے لئے ان کا سمجھنا بالکل ناممکن ہے؀

ادی گرنتھ کا پہلا باب سب سے اہم اور دلچسپ ہے جو جاپو یا جاپجی کے نام سے موسوم ہے۔ جس کو خود بابا نانک نے تحریر کیا ہے۔ اس میں مذہبی عقاید بیان کئے گئے ہیں۔ ادبی لحاظ سے یہ تمام کتاب کے باقی دوسرے حصوں سے بجز ان حصوں کے جن میں کبیر اور شیخ فرید کی صوفیانہ تحریرات ہیں ممتاز ہے اور جس کے متعلق اس سے قبل بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ بھگت کبیر کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے اور اب تک مریدوں کی جو کبیر پنتھی کے نام سے مشہور ہیں بنارس میں ایک خانقاہ موجود ہے جہاں کبیر پنتھ کی تعلیم دی جاتی ہے[1]۔ سب سے پہلے شعرا جن کا کلام گرنتھ میں شامل ہے مرہٹی کے دو شاعر نامدیو اور ترلوکن ہیں جن کی زبان کی خصوصیت زمانۂ حال کی مرہٹی ترکیب پر ہے اور اس سے ان کا دکنی نژاد ہونا ثابت ہوتا ہے؀

گوبند سنگھ جو دسواں اور آخری گُرو تھا ہ اسال کا تھا شاہ اورنگ زیب نے اس کے باپ کو اذیتیں دے کر مار ڈالا۔ گوبند سنگھ بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپا اور اپنی تعلیم کی تکمیل میں مصروف رہا۔ علمیت کے لحاظ سے وہ اپنے سلف سے برتر تھا۔ اسے فارسی ہندی اور تھوڑی سی سنسکرت بھی آتی تھی۔ اس نے اپنے زمانہ آخر کی تحریروں میں سنسکرت کے داخل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ذہانت و قابلیت و مستقل مزاجی میں وہ اپنے پیش رووٴں سے کہیں بڑھ کر تھا اور شروع ہی سے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا تھا کہ سکھوں کو ایک مضبوط اور زبردست قوم بنا کر پنجاب سے مسلمانوں کی قوت کا استیصال کر دے۔ مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ باوجود اس قابلیت اور قصد کے جب تک تیس برس کے سن کو نہ پہنچا وہ اس ارادے کو

---

[1] ساکھی ۹۰ میں گُرو گوبند سنگھ نے کبیر کی بہت تعریف کی ہے اور اس کے متعلق کہا ہے کہ خدا کے نزدیک ہے اور دنیاوی بادشاہوں سے اس کا درجہ بلند تر ہے۔ اس کا نام ایک مدت مدید تک دنیا میں جاری رہیگا۔

عمل میں لانے کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوا۔ اس وقت تک وہ تحصیل علم میں اور اس کام کی تیاری میں مصروف رہا جو اس نے اپنے ذمے لازم کر رکھا تھا۔ ورزش جسمانی سے بھی وہ غافل نہ رہا اور چونکہ اس زمانے میں یہ چیزیں شرفاء کی اولاد کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ اس نے ان میں کمال حاصل کیا۔ جب وہ گوشہ نشینی ترک کر کے باہر نکلا سکھوں نے بلا پس و پیش اسے اپنا اصلی اور موروثی رہنما تسلیم کر لیا اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ وہ اس کے ساتھ مل کر مسلمان ظالموں سے اس کے باپ کے قتل کا بدلہ لیں۔ مہم شروع کرنے سے قبل اس نے ہندوؤں کی دیوی درگا سے منّت مانگی جس کا مندر نینا دیوی کے پہاڑ اس کے جائے سکونت انندپور کے قریب تھا۔ ابتدائی ضروری و سخت ریاضتوں کی انجام دہی کے بعد جو کثرت سے تھیں اور مدت تک جاری رہیں اور دودھ گھی اور اناج چڑھانے پر دیوی نے نمودار ہو کر اپنی محافظت میں لینے کے معاوضے میں انسانی قربانی طلب کی۔ پوجاریوں نے اسے صلاح دی کہ دیوی کے راضی کرنے کے لئے اسے اپنے چار بیٹوں میں سے ایک کا سر نذر کرنا مقبول قربانی ہو گی۔ ان بچوں کی ماؤں نے قدرتی طور پر اپنے بچوں کے بھینٹ چڑھائے جانے سے انکار کیا۔ اس کے بعد گوبند سنگھ نے اپنے دوستوں سے استمداد چاہی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پانچ آدمی بھینٹ چڑھنے پر آمادہ ہوئے اور بالآخر ایک شخص جس کا نام بیان نہیں کیا گیا مندر کے روبرو قتل کیا گیا۔ باوجود اختلاف روایات اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انسانی قربانی کی گئی۔ اگلے زمانے میں یہ خونخوار دیوی جس کی مختلف صورتیں اور نام ہیں اکثر انسانی قربانی طلب کیا کرتی تھی اور صرف سرکار انگریزی کے زمانے سے جب کہ مذہب و قتل کا میل مٹا دیا گیا بجائے انسان کے بھیڑ بکریاں قربانی کی جانے لگیں۔ بہرحال دیوی نے بھینٹ قبول کی اور یہی خونی بھینٹ سے کام کا آغاز گرو گوبند سنگھ کی مابعد کی زندگی اور ہولناک موت کی گویا فال تھی۔ اب گرو نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور اپنے پیش آئندہ کام کی نوعیت و کامیابی پر بھروسہ کر کے دلیری کے ساتھ نئے اصولوں کی تعلیم دینا شروع کی جو نانک کی تعلیم کے خلاف تھی۔ اس کی حیثیت ایک سیاسی مذہب کی تھی سکھوں میں یکجہتی پیدا کرنا تھا تاکہ ارجن و ہرگوبند کی رائے کے مطابق ایک فوجی جماعت بن جائے۔ قدیم سکھ مذہب میں اصطباغ کی قسم کی ایک رسم بھی جاری تھی لیکن وہ

اب متروک ہوگئی تھی۔ گوبند سنگھ نے اس کی تجدید کی اور اسے سکھ مذہب میں شامل ہونے کے لئے لازمی قرار دیا۔ اور اسے اپنے تمام موجودہ مریدوں کو پاہل دیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پانی میں شکر ڈال کر خنجر سے اس کو ہلایا جاتا تھا اور ہلاتے وقت گرنتھ کے جاپ جی کے کچھ منتر پڑھے جاتے تھے۔ جس شخص کو داخل کرنا مقصود ہوتا وہ اس شربت کا ایک گھونٹ پیتا اور باقی شربت اس کے بدن اور سر پر چھڑکا جاتا تھا۔ اور اس وقت اصطباغ دینے والا اور نو آموز مرید "واہ گروجی کا خالصہ" پکارتے جاتے تھے[1]۔

گرو گوبند نے جب اپنے پانچ چیلوں کو اس طرح اصطباغ دے لیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہکر اپنے اوپر بھی یہ رسم ادا کرائی اور سنگھ کا لقب اختیار کیا۔ خالصہ میں پانچ کی تعداد ایک خاص امتیاز رکھتی ہے اور اس سے ایک خاص جماعت کی ترکیب تصور کی جاتی ہے جس میں گرو یہ وعدہ کرتا ہے کہ اس کی روح ہمیشہ ان کے ہمراہ رہیگی۔ گرو گوبند نے نو سکھ لوگوں کو ہدایت کی کہ اصطباغ کی رسم ادا ہونے کے بعد وہ اپنے ناموں کے ساتھ سنگھ کا لفظ استعمال کیا کریں۔ آج کل عوام کی نظر میں سنگھ ہی صرف سکھ مانے جاتے ہیں اور نانکی سکھوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ پھر ہندو جماعت میں واپس گئے۔

گرو گوبند سنگھ کا دوسرا کام یہ تھا کہ سکھوں کی کتابوں کی تطبیق اپنے خیالات سے کرلے اور اس غرض سے اس نے کرتارپور کے پاک شہر میں ادی گرنتھ کے محافظین کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اسے گرنتھ میں اضافہ کرنے کی اجازت دیں۔ لیکن سودھیوں نے جو سکھ پوجاری اور اس مذہبی کتاب کے محافظ تھے اور جو گرو رام داس کی اولاد سے تھے اس جدید رہنما کی پیشوائی قبول کرنے سے انکار کیا۔ ان لوگوں کی اور انندپور اور کرتارپور کے عمال کی حالت سکھ مذہب کے برہمنوں کی سی ہوگئی تھی اور برہمنوں کی طرح ان میں بھی بے انتہا

[1] ڈاکٹر ٹرمپ نے لفظ خالصہ یعنے سکھ سلطنت کے نام کے اشتقاق کے متعلق دوسرے علماء سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خالصہ دراصل عربی لفظ خالصہ ہے۔ اور اس کے معنی کسی شخص کی ذاتی جاگیر کے ہیں۔ چنانچہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گرو یا خدا کی ذاتی جاگیر تھی۔

دعوائے روحانیت کا تفاخر پیدا ہو گیا تھا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ گرو گوبند نانک کی تعلیم سے بھی زیادہ مساوات پیدا کرتا اور سب سے نیچ ذات کے لوگوں اور جو لوگ ذات سے باہر ہو گئے تھے اُن کو برہمنوں کے مساوی کرنا اور خالصہ مذہب کے حقوق دینا چاہتا ہے تو فوراً برسرِ عناد ہو گئے۔ انھوں نے گوبند سنگھ کو جھوٹا مدعی قرار دیا اور اس کے خلاف مذہبی تعلیمات کے اس پاک مذہبی کتاب میں اضافہ کئے جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا جو ان کی سپردگی میں تھی۔ ان لوگوں نے اُسے طعنہ دیا کہ اگر وہ سچا گُرو ہے تو خود کوئی کتاب کیوں نہیں مرتب کرتا۔ گُرو گوبند نے ایسا ہی کیا اور ۱۶۹۶ء میں اس کی کتاب مرتب ہو گئی۔ اس کتاب کی ترتیب میں بابا نانک سے جو تعلیم چلی آتی تھی اُس کو منسوخ یا اُس میں کوئی اہم ترمیم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک جداگانہ تصنیف کی گئی جس سے اس کی جلد برافروختہ ہونے والی طبیعت اور مذہباً پیرو وں کو ایسا کرے جو اُس کا مقصود تھا کہ وہ ایک فوجی قوت میں جو مسلمانوں کے خلاف ترتیب دی گئی تھی لگا دیئے جائیں اور اس مذہب کے معتقدین کے لئے پنجاب کو چھین لیں۔ وہ اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوا اور فدائیوں کی روزافزوں جماعت کے ساتھ اس نے نئے مذہب کی اشاعت کا کام آغاز کیا جو اس کی زندگی کا منشا تھا[1]۔ سب سے پہلے اس کا مقابلہ کانگڑے کی پہاڑیوں کے راجپوت سرداروں سے ہوا جنھوں نے اپنی تمام قوت کو مجتمع کر کے انندپور کے مقام پر اس پر دھاوا کرنا چاہا۔ ایک لڑائی میں جو چمکور کے قریب ہوئی اور جو مقام اب تیرتھ گاہ مانا جاتا ہے اس کے دو بیٹے اجت سنگھ اور جوہر سنگھ مارے گئے۔ شاہی فوج راجپوتوں کی امداد کو آ گئی اور گُرو گوبند کو انندپور سے اور پھر مچھی واڑے سے نکال دیا اور اس کے دونوں بیٹوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں بیٹے سرہند بھیجد ئے گئے اور وہاں شاہنشاہ اورنگ زیب کے حکم سے زندہ دفن کر دئے گئے۔ گُرو گوبند سنگھ ستلج کے جنوبی

---

[1] میرے ایک دوست سردار عطر سنگھ نے جو اور بلو ستلج کے سرداروں میں ہیں۔ اور بہادر کے جاگیردار ہیں ساکھیوں کے ایک نہایت دلچسپ مجموعے کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ ان میں گُرو تیغ بہادر سنگھ اور ان کے بیٹے گُرو گوبند سنگھ کے دیس بہ دیس آوارہ پھرنے اور جو واقعات ان کو پیش آئے اُن کا ذکر ہے۔

جنگلوں میں بھاگتا پھرا اور بہت سی مشکلات کے بعد پٹیالے کے علاقے میں تلونڈی مقام پر مقیم ہوا۔ اس نے لوگوں کو ہدایت کی کہ جس طرح ہند و بنارس کو مقدس مقام مانتے ہیں اسی طرح سکھ اس مقام کو تصور کریں۔ یہ جائے قیام ومدمے کے نام سے موسوم کی گئی کیونکہ لفظ دم کے معنی سانس لینے کے ہیں اور یہ مقام گویا گُرو کے ٹھیر کر سانس لینے کا تھا۔ یہ سکھوں کا بہت بڑا مرکز ہے۔ گرمکھی کے سب سے بہتر مصنف یہیں ملتے ہیں۔ ایک دوسرا مقام بھٹنڈا بھی جو اس ریاست کے علاقے میں ہے گرو کا دمدمہ مانا جاتا ہے۔ یہاں اس نے ایک بھوت کو نکالا جو تمام شہر کو برباد کر رہا تھا۔ اور کچھ عرصے تک وہ اس قرب وجوار میں مقیم رہا اور اس اثنا میں اس کی شہرت واثر میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی گئی ؎

ساکھیوں میں اس کے اس جگہ کے قیام کے متعلق بہت دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ اور مذہبی مبالغوں کی آمیزش سے قطع نظر کر کے یہ ایک صحیح مرقع سکھوں کے اس گُرو کا تصور کئے جا سکتے ہیں جس کا شاہانہ دربار تھا جو اپنی فیاضی اور سخاوت سے لوگوں کو گرویدہ کر کے اپنا مرید بنا لیتا تھا اور مذہبی پیشوائی کے دعوے کے لئے معجزات کی بھی کمی نہ تھی۔ ساکھیاں گُرو کی حیرت انگیز قوت کے خوارق عادات کے بیان سے بھری پڑی ہیں۔ ہمیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی دعا سے جو والدین اولاد سے محروم تھے وہ صاحب اولاد ہو گئے۔ اس نے بھوت پریت اتارے۔ دیہات سے بیماریاں دفع کیں۔ کھاری پانی کو میٹھا کر دیا۔ دغا و فریب کی سزا میں مُہلک موروثی بیماری پیدا کر دی اور سوکھے درخت پھولے پھلے۔ ایک موقع پر ہند و مسلمان چور جو اس کے گھوڑے چرانے آئے تھے اندھے ہو گئے اور دوسرے موقع پر جمعبندی کا اہلکار جو اس کے ایک معتقد کی پیداوار پر تشخیص لگان کرنیکے لئے آیا تھا بالکل حساب کتاب بھول گیا اور اس نے گُرو کی طاقت کو مان کے سکھ مذہب قبول کیا ؎

گوبند سنگھ کی شان وشوکت بغیر جبر و تعدّی کے نہ نبھ سکتی تھی اور گُرو کی مسند یا نایب شاہی تحصیلداروں کے جانشین بن گئے تھے۔ یہ لوگ اس درجہ لالچی و دست دراز ہو گئے تھے اور ان کی وجہ سے اس قدر بد دلی اور مزاحمت پیدا ہو گئی کہ گُرو گوبند کو بالآخر انھیں بالکل برخاست کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن انندپور

میں واپس آگیا۔ راستے میں اس کا گذر سرہند سے ہوا اس کے معتقدین باوصف فہمائش اس مقام کو اس کے دونوں بیٹوں کے ظالمانہ طریقے پر قتل کئے جانے کے انتقام میں تباہ و برباد کرنے سے بہ مشکل باز رہ سکے اس نے اس گانوں کو سراپ دی اور اپنے معتقدین کو ہدایت کی کہ جب کبھی وہ گنگا کی تیرتھ اور اشنان کے لئے یہاں سے ہو کر جائیں یا وہاں سے واپس آتے ہوئے اس راستے سے گذریں تو اس گانوں کے مکانوں میں سے دو اینٹیں لے کر ستلج یا جمنا میں پھینک دیں ورنہ ان کا گنگا اشنان اکارت جائیگا۔ ابتک جو سکھ پیادہ پا تیرتھ کو جاتے ہیں اس حکم کی پابندی کیا کرتے ہیں لیکن ریل کے سفر نے پیادہ پا جاتریوں کی تعداد میں بہت کچھ کمی کر دی ہے۔ میرا گذر اکثر سرہند کے کھنڈروں اور وہاں کے خس و خاشاک کے انباروں میں ہوا ہے جس میں اب اصلی سرہند مدفون پڑا ہوا ہے اور ان کو دیکھ کر مجھے بھی اکثر اس بات کا خیال آیا ہے کہ درحقیقت یہ مقام لعنت زدہ ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد بعض وجوہ سے جن کا انکشاف نہیں ہوا اور اب تک مبہم ہیں۔ اور یقیناً اس کے طرز زندگی اور تعلیم کے خلاف تھے اس نے بہادر شاہ کی ملازمت کرلی یا یہ صورت ہوئی کہ مسلمان بادشاہ کو اس نے اپنا ایک سکھ دستہ سواروں کا سپرد کر دیا اور خود اس کی سرکردگی اس لئے اختیار کی کہ اس کے عام طور پر باغیانہ روش کے بارے میں شک و شبہ دور ہو جائے اور دار و گیر سے اسے کچھ عرصہ تک نجات ملے بہرحال وہ اپنے پیرؤوں کے ہمراہ دکن گیا جہاں اسے ایک افغان کے رشتہ داروں نے قتل کر ڈالا جس کو اس نے ایک موقع پر غصے میں آکر قتل کیا تھا۔ ۱۷۰۸ء میں وہ (۴۸) سال کا ہو کر مقام نانڈیڑ میں فوت ہوا جو دریائے گوداوری کے کنارے پر واقع ہے۔ اس مقام کو سکھ اچل نگر یعنی جائے روانگی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہاں اس کی یادگار میں ایک مندر قائم ہے جہاں بہت سے سکھ سال بہ سال جاترا کے لئے آتے ہیں۔ گرو گوبند کی تعلیم کے سمجھنے کے لئے نانک کے اصول عقائد کا مختصر بیان ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے کہ گو سکھ لوگ ادی گرنتھ کی تعظیم بطور الہامی کتاب کے اسی طرح کرتے ہیں جس طرح عیسائی اور مسلمان اپنے کتب مقدسہ کی لیکن نانک اور اس کے جانشینوں کی

تحریروں میں جنہیں گرو ارجن نے یک جا جمع کیا ہے کوئی جدید اور نادر بات ایسی نہیں ہے جس سے وہ اس سے زیادہ عظمت کی مستحق قرار دی جاسکیں۔ جو پنجابی ہندوؤں نے بھگت کبیر ایسے بزرگ اشخاص کی تعلیم کی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ خود نانک نے اپنے تحریرات میں ان سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ آدی گرنتھ کے مندرجہ عقائد ہندوؤں کی متصوفانہ قدیم اور خالص تعلیم سے بہت کم اختلاف رکھتے ہیں۔ نانک خود صوفی مشرب تھا۔ اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس نے سنیاس میں بسر کیا۔ گرو گوبند کی طرح اس کے خیالات سیاسی نہ تھے بلکہ درستی اخلاق پر مبنی تھے اور اس کا مقصود یہ تھا کہ ہندو جو اوہام اور باطل پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں اس سے ان کو نکالا جائے اور ان کو نیک عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی جائے اس پر لفظ مصلح کا پورا پورا اور صحیح طور پر اطلاق ہوتا ہے اور سکھ مذہب جس کی اس نے تلقین کی تھی باوجود اس کے کہ آدی گرنتھ کے اخلاق و مبالغے سے بھرا ہے ایک ایسا مذہب ہے جو علمی و تمدنی لحاظ سے اعلیٰ نمونہ تصور کیا جاسکتا ہے اور جو مہذب دنیا کے دوسرے فلسفیانہ مذاہب کے زمرے میں بلند پایہ ہے ؛

نانک کے خصائل و تعلیم میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو محققین کو بودھ مذہب کے بڑے مصلح کی زندگی و تعلیم کو یاد دلاتی ہیں جو عامۂ خلایق کی بہبودی میں منہمک تھا اور جس کے عاقلانہ عقائد نے نسل انسانی کے ایک چوتھائی حصے پر وسیع اثر کیا ہے ؛

گرو نانک کے عقائد کا اصل اصول وحدانیت کی تعلیم ہے یعنے یہ کہ خداوند تعالیٰ وحدہ لاشریک لہٗ ہے جیسا کہ اس دوہے میں بیان کیا گیا ہے ؛

تری ذات بے عیب ہے اے خدا نہیں مثل تیرے کوئی دوسرا

اسبارے میں ہندو مسلمانوں کے اختلاف کا بھی اعتراف کیا گیا ہے چنانچہ یہ تحریر ہے کہ طریقے دو ہیں (یعنے ہندو مذہب و اسلام) لیکن خدا صرف ایک ہے۔ خدا کو خواہ کسی نام سے پکارو۔ خواہ اسے برہم کہو ہری۔ رام خواہ گوبند وہ ہر صورت میں سمجھ سے بالاتر۔ ان دیکھا۔ لم یلد اور قدیم ہے اور صرف اسی کا وجود حقیقی ہے وہ تمام چیزوں کا مبدأ اور علت العلل ہے اور انسان اور دوسرے موجودات عالم کا وجود اسی سے ہے اور اسی سے تمام چیزوں کا انکاس ہے۔ جس طرح ڈارون نے مسئلہ ارتقاء اجناس کی تعلیم دی ہے اسی طرح نانک نے بھی اپنی تعلیم میں یہ نہیں کہا کہ قادر مطلق نے نیست سے ہست کیا بلکہ خود اپنی ذات سے

تعدد صور[1] کو اختیار کیا۔ یہ تعلیم ہمہ اوست کی ہے جو گرنتھ میں الوہیت کی رفیع الشان تعلیم کے دوش بدوش مذکور ہے اور کہیں ایک اصول پر اور کہیں دوسرے اصول پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن مجموعی حالت میں گرنتھ کی تعلیم یہ ہے کہ ذی حیات اور غیر ذی حیات تمام موجودات عالم کا ظہور اُسی کی ذات سے ہے وہ خود موجود ہے اور سوا اُس کے کوئی شئے حقیقی یا موجود بالذات نہیں۔ قادر مطلق کے بغیر یہ عالم ایک سایہ۔ سراب یا مغالطۂ نظر ہے۔ گرنتھ کے صفحہ ۶۶۵ پر یہ تحریر ہے کہ :-

ا۔ اس ایک ذات کا جلوہ ہر طرف و ہر شئے میں نمایاں ہے جہاں کہیں نظر ڈالو وہی وہ نظر آتا ہے۔ وہ ایک کثرت میں پھیلا ہوا اور سب میں سمایا ہوا ہے۔ جدھر میں دیکھتا ہوں وہی نظر آتا ہے مایا کے دلفریب سراب نے دنیا کو لبھا رکھا ہے۔ بہت کم ایسے لوگ ہیں جو حقیقت آشنا ہوں سب گوبند ہے اور سب گوبند ہے۔ گوبند کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ جس طرح ایک ڈوری میں سات ہزار دانے پروسے ہوئے ہوں اسی طرح خدا طول وعرض میں ہر طرف ہے۔

۲۔ پانی کی موج۔ کف اور حباب پانی سے جدا نہیں ہوتے۔

یہ دنیا برہم کی بازیگاہ[2] ہے وہی بازیگر ہے۔ وہ اور نہیں ہوتا گرنتھ میں الوہیت کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ ہستی عظیم اپنی مخلوق سے بالکل جدا ہے اُس نے خلق کیا ہے اُسی مخلوق کا ظہور ہے۔ مایا یا فریب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ مایا سے بے لوث اور قائم ہے اس طرح جیسے کنول کا پھول اپنے کنڈ سے جدا ہوتا ہے جہاں وہ موجود ہے گرنتھ کے اکثر حصص میں شرک کی تردید و تکذیب کی گئی ہے جب کہ وہ بت پرستی کی شکل اختیار کرے۔ لیکن نانک نے اپنی تعلیم میں براسبہ شرک کی مخالفت نہیں کی ہے اور ویدوں کے لاکھوں عام معبودوں کے ماننے کی اجازت دی ہے جو اس کے خیال میں اس ہستی عظیم سے بدرجہا کمتر ہیں جس سے مثل اور دوسری اشیاء کے ان کا وجود عالم ہستی میں آیا۔

[1] یہ تعلیم مذہب اسلام کے بالکل خلاف ہے خداوند تعالیٰ عالم کی علت مادی نہیں ہے جو کہ اس تعلیم کا منشا ہے بلکہ وہ مادے کا خالق ہے خدائے تعالیٰ کا ارادہ علت فاعلی ہے۔

[2] معاذ اللہ خدا کی ذات پاک کھیل کود سے مبرا ہے۔

نانک نے یہ تعلیم دی کہ انسان کی بڑی جد وجہد یہ ہونی چاہیئے کہ وہ تناسخ[۵] سے کسی نہ کسی طرح نجات حاصل کرلے جس سے ہندو و سکھ کو یکساں اندیشہ ہے؛

ہندوؤں کا مسئلہ یہ ہے کہ تمام دنیاوی افعال کے ساتھ خواہ اچھے ہوں یا بُرے جزا و سزا لگی ہوئی ہے پارسا اشخاص بہشت میں داخل ہوتے اور اپنی پارسائی کے لحاظ سے ایک مدت تک مقیم رہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نیک شخص پھر انسانی صورت کی بہترین حالت میں دوبارہ جنم لیتے ہیں اور یہ سلسلہ تناسخ جاری رہتا ہے اور ان کے افعال کے لحاظ سے ان کا آیندہ جنم ہوا کرتا ہے۔ اگر اس شخص کی زندگی بدکاری یا دنیاداری میں گذری ہے تو وہ دوزخ میں رکھا جاتا اور وہاں ایک مدت تک سزا بھگتنے کے بعد جانور کی شکل میں جنم لیتا ہے۔ جو شخص زیادہ اخلاقی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ ادنیٰ درجے کے جانوروں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اور بے انتہا جنم لینے کے بعد وہ پھر آدمی ہو جاتا ہے اور اس قابل بنا دیا جاتا ہے کہ نیک افعال سے اپنے پرانے جنموں کے گناہ کو دھو ڈالے۔ گرنتھ کی تعلیم کے لحاظ سے بھی انسان اپنے افعال کے انجام دینے میں کچھ زیادہ مختار نہیں ہے کیونکہ اس کی قسمت کا پہلے ہی سے تصفیہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ یہ فیصلہ اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے بہر حال یہ بالکل بیّن اور صریح ہے کہ گرنتھ نے انسان کے افعال کے بارے میں خود مختاری سے بالکل انکار کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ خواہ انسانی روح کا رجحان کتنا ہی نیکی کی طرف کیوں نہ ہو۔ لیکن پھر بھی مایا کی دست برد سے نہیں بچتی اور یہ ہمیشہ اس کو ٹھیک راستے سے بھٹکاتی رہتی ہے نیکی۔ جہل اور شہوت وہ تین صفات ہیں جن میں سے ایک نہ ایک ہر انسان کی روح پر غالب رہتی ہے۔ اور انھیں صفات کے غلبے پر انسان کی موجودہ زندگی اور آخرت کی بھلائی کا انحصار ہے۔ اس نئے مذہب کے استحکام اور لوگوں کے اس کی جانب رجوع ہونے کا سب سے قوی سبب یہی تھا کہ وہ تناسخ سے رہائی دلانے کا وعدہ کرتا تھا جس کا خوف ہمیشہ عوام کے دلوں میں لگا رہتا تھا۔ جس طرح بہشت و دوزخ کی کنجیاں پطرس اعظم کے تفویض تصور کی جاتی تھیں اور اس اعتقادی قبضے کی وجہ سے رومی کلیسا نے لوگوں کے قلوب تسخیر کرکے اس قدر اقتدار حاصل کرلیا تھا اسی طرح گرو کی مدد سے تناسخ سے رہائی پا جانے کے دعوے نے

---

[۵] تناسخ کا عقیدہ بھی مذہب اسلام کے خلاف ہے۔

سکھ مذہب کو مقبولیت عطا کی ۔ فیروز پور کے جنگلوں میں جہاں گو بند سنگھ نے شاہی فوج سے مقابلہ کر کے شکست کھائی اس نے اپنے تمام معتقدین کو جو لڑائی میں مقتول ہوے یہی مکتی دینے کا وعدہ کیا ۔ اس رہائی کی یادگار میں ایک بڑا قصبہ آباد اور ایک تالاب تعمیر کیا گیا جو اب تک مکتسر کے نام سے مشہور اور بڑی زیارت گاہ تصور کیا جاتا ہے ؛

اس عام مقدر سے نجات پانے اور ذات الٰہی سے وصال ہو جانے کے لئے ہری کے بزرگ نام کے جاپ کی ضرورت تھی اور اس کی اجازت صرف ان لوگوں کو دی جاتی تھی جو اس مذہب میں صحیح وجائز طریقے سے داخل ہوے تھے ۔ جنھیں خود گرو نے چیلہ بنا کر صحیح طور پر اس بزرگ نام کے جپنے کی تعلیم دی تھی ۔ لیکن گرو کا اس طرح تلقین کرنا مسئلہ قضا و قدر کے لحاظ سے صرف ان ہی مخصوص چیلوں تک محدود تھا جن کی قسمت میں قسّام ازل نے اس قسم کی رہائی لکھدی تھی ۔ اس مسئلۂ تقدیر پر بحث نہیں کی گئی تھی جسکی بظاہر یہ وجہ تھی کہ جب لوگ عام طور پر یہ سمجھنے لگیں گے کہ گرو کو اپنے پیرووں کی قسمت کے بدلنے میں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے تو اس کی عظمت میں فرق آئیگا عام طور پر یہ تعلیم دی گئی تھی کہ مذہبی پابندی اور گرو کی تعلیم پر صبر و استقلال کے ساتھ عمل کرنے سے دل نکوکاری کی طرف رجوع ہوگا اور اس وقت ایسا موقع نصیب ہوگا کہ انسان کا نوشتہ تقدیر جو اس کے ارادے سے کہیں بالاتر ہے بدل سکے ۔ اگر اس عقیدے میں تناقض تھا تو وہ جبر و اختیار کے مسئلے کے لحاظ سے تھا جس سے ان اٹل احکام قضا و قدر سے بچنے کے متعلق انسانی خواہش کا اظہار ہوتا تھا جو تمام عالم پر محیط اور نسل انسان پر حاوی ہے ؛

گرنتھ کی سب سے اہم تعلیم یہ ہے کہ گرو کی وقعت واطاعت اور رشیوں کی عظمت اور پرستش کی جاے ۔ پاک وصاف رہنے خیرات دینے اور گوشت خواری سے پرہیز کرنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے ۔ اخلاقی امور کے متعلق بدگوئی ۔ بدکاری ۔ غصہ ۔ طمع ۔ خود غرضی اور بد اعتقادی کی خاص طور پر ممانعت کی گئی ہے ۔ نانک نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ متاہل شخص جو خاندان کا سردار اور کاروبار دنیا میں مصروف ہو قابل عزت سمجھا جائے اور اس نے خاص کر اس بات کی تردید کی تھی کہ رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے سے کوئی خاص خوبی اور عظمت پیدا ہو سکتی ہے ۔ اس کے نزدیک ہر ایک سچا مذہب

صرف رسوم کی ظاہری پابندی اور مذہبی طریق اختیار کرنے تک محدود نہیں بلکہ اس کا زیادہ تر انحصار ہمارے قلب کی حالت پر ہے اور روحانی معاملات پر معمولی کاروبار دنیوی میں مصروف رہکر بھی انسان غور و خوض کرسکتا ہے اس کے لئے بادیہ پیمائی یا خانقاہوں میں عزلت گزینی ضرور نہیں۔ یہ سچ ہے کہ سکھوں کے اکثر تارک الدنیا فرقے جیسے اداسی وا کالی نے تعداد کثیر میں ایک زمانے کے بعد نانک کی اس تعلیم سے انحراف کیا۔ لیکن یہ لوگ کم و بیش لامذہب مانے جاتے ہیں اور عموماً سکھ مذہب جس کی نانک و گوبند سنگھ نے تعلیم دی دنیادار لوگوں کے لئے بہت ہی موزوں ہے ؛

گوادی گرنتھ برہمنوں کے سخت خلاف اور ان کے دعووں کا منکر و مخالف ہے لیکن نانک نے براسہ ذات کی قید مٹائے جانے کی تعلیم نہیں دی لیکن پھر بھی اس کی تعلیم کا رجحان جمہوریت کی طرف تھا اور اس نے بلا امتیاز ذات ہر قسم کے لوگوں کو اپنا چیلہ بنایا۔ نانک کی تعلیم اس کے جانشینوں کی تعلیم سے ملتی جلتی تھی اور گرو گوبند کے زمانے تک اس میں کوئی اہم تغیر مذہبی و تمدنی حیثیت سے واقع نہیں ہوا۔ گرد گوبند کی تعلیم اور اس کے اصولوں نے سکھوں میں ایک دور جدید کی بنیاد ڈال دی اور وہی نانک کی تعلیم سے بڑھ کر انھیں ایک فوجی جماعت بنا دینے کی محرک ہوئی اور اس کے اثر سے وہ آخر درحقیقت ایک فوجی گروہ بن گئے ؛

گرو گوبند سنگھ کا رجحان اگرچہ ہمہ اوست کی لطیف تعلیم کے مقابلے میں شرک و بت پرستی کی جانب تھا لیکن انند پور کے سدھیوں نے جب اسے نئی پوتھی مرتب کرنے کا طعنہ دیا تو اس نے اپنے بزرگ پیشرو کی تعلیم پر کسی قسم کا حملہ کرنا مناسب سمجھا اور نہ اس بات کی خواہش کی۔ اس کی بڑی خواہش صرف یہ تھی کہ سکھوں کا ایک جتھا قائم کرکے انھیں ہندوؤں سے بالکل علیحدہ کردے تاکہ مسلمانوں کے مقابلے کے لئے انھیں وہ زیادہ آسانی سے آمادہ کرسکے۔ اس ضمن میں اس نے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے فرقے میں ذات کے تفرقے کو مٹایا جس پر برہمن مذہب کا دار و مدار ہے اسی کے باعث سے اس مذہب کے پجاری قدرتی طور پر اس سے برافروختہ ہو گئے اور دوسرے اعلیٰ ذاتوں والے بھی اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ کیونکہ اس طرح ان لوگوں کو جنھیں وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے سکھ مذہب میں داخل کرنے سے

ان کے دیرینہ حقوق کی تحقیر اور اُن کے تلف ہونے کا خوف تھا۔ نانک کا یہ عمل اونچی ذات کے ہندوؤں کی تبدیل مذہب کے لئے سدّ راہ تھا لیکن گرو گوبند کی طرح اس نے اس امر کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی ؛

گوبند سنگھ کی دوسری ہدایتیں جو اس نے اپنے پیروؤں کو ہندوؤں کی عام جماعت سے جدا کرنے کی غرض سے کی تھیں اُن سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں یہ ہدایتیں زیادہ تر طرز لباس۔ آداب اکل و شرب و پرستش کے بارے میں تھیں سکھوں کو نیلے لباس پہننے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن عرصے سے یہ طریقہ متروک ہو گیا ہے صرف اکالی سکھ اس کے پابند ہیں۔ انھیں تلوار باندھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اور اس کے علاوہ اور پانچ اشیاء رکھنے کی جن کے نام پنجابی زبان میں حرف ک سے شروع ہوتے ہیں۔ کیس یعنے ڈاڑھی و سر کے بال۔ کھنڈا یا خنجر۔ کنگھا یا شانہ۔ کڑا یا آہنی چوڑی۔ کچھ یا گھٹنوں تک پاجامہ۔ پانچویں چیز کے استعمال کی ہدایت اس لئے کی گئی تھی کہ اُن کا ہندوؤں سے امتیاز ہو جائے۔ کیونکہ ہندو عموماً دھوتی باندھتے ہیں۔ اسکے علاوہ سکھوں کو تمباکو نوشی کی بھی ممانعت کی گئی جس کا عام طور پر ہندوؤں میں رواج ہے۔ اس کی پابندی میں یقیناً دقت ہوئی ہوگی مگر اس کا نتیجہ بھی مفید نہ ہوا۔ کیونکہ سکھ اس کے معاوضے میں افیون و بھنگ کے بہ کثرت عادی ہو گئے جو تمباکو سے بدرجہا زیادہ مضر ہے وسط ایشیا کے جوشیلے مسلمانوں میں بھی اس قسم کے ممانعت کا یہی نتیجہ ہوا ؛

دختر کشی کی ممانعت کی گئی اور اس کے مرتکب کو ملعون قرار دیا گیا۔ گوبند سنگھ کے زمانے میں اور سرکار انگریزی کے پنجاب کو الحاق کرنے کے وقت تک یہ رسم پنجاب میں شدت سے جاری تھی خصوصاً اونچی ذاتوں میں۔ جیسے راجپوت جنھیں اپنی لڑکیوں کی شادی کرنے میں بڑی وقت پیش آتی تھی۔ مثلاً جمو کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے راجپوت خاندان کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس خاندان میں علی العموم یہ رسم جاری تھی اور ۱۸۷۱ء تک اس خاندان میں کبھی کسی لڑکی کی شادی نہیں ہوئی۔ اس سال مہاراجہ کی پوتی کی شادی جسوال کے قدیم خاندان کے لڑکے کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے رچائی گئی۔ باوجود گوبند کی ممانعت کے سکھوں میں

مدت تک یہ رسم جاری رہی اور اب بھی پنجاب کے بعض مقامات میں سکھ پوجاریوں کے بعض خاندان ہیں جن میں اس رسم کے رواج کا شبہ باقی ہے لیکن عام طور پر انگریزی حکومت کے اثر نے اس بزدلانہ قبیح رسم کا پنجاب میں خاتمہ کر دیا ہے۔ لڑکی یا بہن کو دان لے کر بیاہنے کی بھی ممانعت کی گئی تھی لیکن اس حکم سے بھی اکثر پہلوتہی کی جاتی ہے ؛

سکھوں کو اس ذبیحے کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی جو عام طریقے پر کیا جائے اور یہ ہدایت تھی کہ جس جانور کا گوشت وہ کھائیں اسے تلوار کی ایک ہی ضرب سے ہلاک کیا جائے جس کو عموماً جھٹکا کہتے ہیں۔ گرنتھ میں گائے کے گوشت کی کوئی خاص ممانعت نہیں ہے لیکن قدیم روایات کا گہرا اثر دلوں پر بیٹھا ہوا تھا اور سکھوں کے نزدیک بھی گائے کی وہی حرمت برقرار رہی جو ہندوؤں کے نزدیک ہے۔ سرحدی لوٹ مار میں جب کبھی مغلوب مسلمان سکھوں کے قدموں پر گر پڑتے اور گھانس کا چھوٹا سا پولا اٹھا کر اپنے دانتوں میں دبا لیتے اور پکارتے کہ "میں تمہاری گائے ہوں"۔ مسلمان خاص طور پر ملعون تصور کئے جاتے تھے اور سکھوں کو ٹوپی پہننے سے باز رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ لباس میں بھی ان کا مسلمانوں سے امتیاز ہو۔ ان دشمنان ایمان کے ساتھ لڑائی کرنے کی ہدایت تھی اور انھیں کسی طرح امان دینے کی اجازت نہ تھی۔ ان کے علاوہ اُن سکھوں کو جو مذہب کے پابند نہ ہوں اور جین اور جوگیوں کو بھی ملعون قرار دیا گیا تھا ؛

دوسرے جزوی امور کے جواز و عدم جواز کے متعلق بھی ہدایتیں کی گئی تھیں۔ ایک سب سے اہم فرض گرنتھ کا روز پڑھنا قرار دیا گیا تھا جس کی تعمیل ناممکن تھی کیونکہ سکھ عموماً ناخواندہ ہوتے تھے اور مجبوراً انھیں اسی امر پر قناعت کرنا پڑا کہ وہ گاہے ماہے اس کو پوجاریوں یا گرنتھیوں سے پڑھوا کر سن لیا کریں یا اس کا کوئی حصہ جسے انھوں نے حفظ یاد کر لیا ہو دُہرا لیا کریں ؛

گوبند سنگھ کی تعلیمات کے شایع ہونے کے بعد سکھوں کے عقائد میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا لیکن جیسا کہ کسی دوسری جگہ بیان ہو چکا ہے ان ہدایتوں کی تعمیل میں سہل انگاری ہونے لگی یہاں تک کہ ابھی چند سال قبل مصلحوں کی ایک جماعت

پیدا ہو گئی جس کی بناء راولپنڈی کے ایک اداسی فقیر نے قائم کی۔ اس کا جانشین ضلع لدھیانہ کا ایک نجار رام سنگھ نامی بڑا صاحب اثر شخص ہو گیا اور بہت سے فدائی اس کے ساتھ ہو گئے جو کوکا کے نام سے موسوم کئے گئے۔ یہ لوگ خاص لباس باہمی شناخت کے لئے خاص الفاظ معین کرنے اور سیاسی جماعت قایم کرنے کی وجہ سے دوسروں سے تمیز کئے جاتے تھے؛

اصل تحریک کا رنگ شروع میں مذہبی تھا جس کا مقصود یہ تھا کہ سکھوں کے طرز عمل کی اصلاح کر کے انھیں گوبند سنگھ کے زمانے کے مطابق بنایا جائے۔ جس قدر اس جماعت میں ترقی ہوتی گئی ان لوگوں کے حوصلے بھی بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ خالصہ حکومت کی تجدید اور انگریزی کے نیست و نابود کرنے کی تلقین شروع کر دی گئی اُس وقت میں حکومت پنجاب کا چیف سکرٹری تھا اور ان دنوں میں کوکوں کی کارروائیوں سے بہت کچھ تشویش و پریشانی پیدا ہو رہی تھی۔ باوجود ان کے باغیانہ اور مغویانہ تعلیم کے ان کے ساتھ کوئی مزاحمت اس وقت تک نہیں کی گئی جب تک انھوں نے علانیہ بغاوت پھیلا کر لدھیانے کے قریب مسلمانوں کے قصبے مالیر کوٹلہ پر حملہ نہیں کیا۔ اس واقعے کے بعد بغاوت نہایت سختی کے ساتھ فرو کی گئی اور سرسری تحقیقات کے بعد ۵۰ اشخاص کو توپ دم کیا گیا۔ اس کے علاوہ کوکا سرغنوں کو پنجاب کے مختلف اضلاع میں ایک ہی شب میں گرفتار کر لیا گیا اور وہ جلاوطن کئے گئے۔ ان میں سے کچھ رنگون بھیجے گئے کچھ عدن اور جو زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے وہ پنجاب کے قید خانوں میں قید کئے گئے۔ قسمت انبالہ کے مقامی عہدہ داروں کا باغیوں کو توپ دم کرنا حکومت پنجاب اور حکومت عالیہ نے ناپسند کیا اور ہنگامہ فرو کرنے کے لئے اس عمل کو سنگین تصور کیا لیکن ان کی کارروائی نیک نیتی پر محمول کی گئی اور عموماً اس مصلحت کی تائید کی گئی جس کی بناء پر اس ہنگامے کو اس قدر جلد اور یقینی طور پر فرو کیا گیا بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ جو کارروائی اس وقت کی گئی اس سے اس زبردست اور ہیبت ناک شورش کی پورے طور پر بیخ کنی ہو گئی جو حکومت برطانیہ کے خلاف برپا کی گئی تھی اور گو کوکا جماعت نیست و نابود نہیں ہوئی لیکن یہ فرقہ ذلیل و خوار تصور کیا جانے لگا اور اس کی دست برد و عیاشانہ روش کی وجہ سے سکھوں کی جماعت

عام طور پر اسے حقیر و ذلیل سمجھنے لگی ہ؎

عام معاملات میں سکھ ہندو شاستر کے پیرو تھے لیکن بعض اہم معاملات میں خصوصاً شادی بیاہ کے بارے میں وہ خود اپنے علیحدہ مراسم کے پابند تھے اور اس لحاظ سے وراثت و ترکے کے معاملات پران مراسم کا اثر پڑتا تھا یہ مسلمہ قاعدہ تھا کہ اگر ورثاء ذکور نہ ہوں تو بیوہ کو تمام جائداد و ترکے میں مل جاتی تھی لیکن اس نامہذب زمانے میں جب کہ تنازعات کا تصفیہ صرف تلوار سے ہوا کرتا تھا اور مستورات میں اتنی طاقت نہ تھی کہ مردوں کی کمائی پر جو انھوں نے اپنے قوت بازو یا زبردستی حاصل کی تھی قبضہ برقرار رکھ سکیں اس رسم سے بڑی مشکلیں پیش آتی تھیں۔ سکھ مستورات میں بھی اپنی جنس کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں اور اکثر اوقات دانشمندی اور خوش انتظامی میں مردوں کے ہم پایہ ثابت ہوئی تھیں پٹیالہ کی رانی اوس کور۔ انبالہ کی رانی دیا کور اور مائی سوڈا کور جو مدت تک زبردست کنھیا خاندان کے جتھے کی سرغنہ رہیں اس کی مثالیں ہیں۔ لیکن عموماً جب کوئی جائداد کسی سکھ بیوہ کے ہاتھ لگ جاتی تھی تو اندیشہ یہ رہتا تھا کہ وہ اس کے آشنا کے دست تصرف میں نہ آجائے اور وہ اس کو اس وقت تک اپنے ذاتی نفع کے لئے استعمال نہ کرے جب تک کہ کوئی دوسرا شخص جس کا حق مرجح ہو اس پر قبضہ نہ کرلے۔ اس خرابی کے دفعیے کے لئے متوفی کے بھائی کے ساتھ اس کی بیوہ کے ازدواج کی رسم کو رواج دیا گیا جو اگلے زمانے میں یہودیوں میں جاری تھا۔ بیوہ کو اختیار تھا کہ متوفیٰ کے بھائیوں میں سے جسے چاہے پسند کرلے لیکن بڑا بھائی اگر چاہے تو اس کا حق مرجح سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے ازدواج کو چادر ڈالنا نیز کریوا دکری ہوئی) کہتے تھے جس سے مراد یہ تھی کہ عورت کا پہلا بیاہ ہو چکا ہے۔ چونکہ اس رسم کی غرض یہ تھی کہ خاندان میں جائداد کی توریث قایم رہے اس وجہ سے اس قسم کے ازدواج سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ ویسی ہی جائز سمجھی جاتی تھی جیسے باقاعدہ شادی بیاہ کی اولاد۔ اور توریث کے بارے میں ایسی اولاد کے حقوق بھی اس قسم کی اولاد کے مساوی تھے لیکن اُن کا رتبہ و وقعت شادی کی اولاد کی سی نہ تھی۔ چادر ڈالنے کے رسم کی سہولت نے خصوصاً لڑائی کے موقع پر جب کہ شادی کے دیر طلب مراسم انجام دینا دشوار تھے یا دلہن کے ذات ورتبے کے لحاظ سے موزوں نہ تھے جو اکثر لونڈی یا لڑائی میں گرفتار کی ہوئی کوئی لڑکی ہو سکتی تھی

بھائی کی بیوہ کے علاوہ دوسروں کے ساتھ بھی اس طریقۂ عمل کو عام طور پر رائج کردیا لیکن چونکہ ایسے موقعے پر خاندان میں توریث برقرار رکھنا مقصود نہ تھا اس لئے چادر ڈالی ہوئی بیوی اور اس کی اولاد کی کوئی وقعت نہ تھی اور اس کی حیثیت آشنا سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ چونکہ اس طریقے میں کوئی رسم ادا نہ کیا جاتا تھا اس لئے اس کی حالت ہمیشہ مشتبہ رہتی تھی اور بسا اوقات لونڈیوں نے اپنے آقاؤں کی وفات کے بعد اس قسم کی چادر ڈالنے کے ازدواج کی بنا پر جائداد کا دعوے کیا اور لوگوں نے ان کی تائید میں جھوٹی گواہیاں دیں کیونکہ مشرق میں ایسی گواہی دستیاب کرنا کچھ دشوار نہیں ہے[1] مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ماں کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ صرف محل کی سازش سے لاہور کے تخت کا وارث قرار دیا گیا۔ حالانکہ اس کی ماں ایک معمولی لونڈی تھی۔

عام طور پر یہ امر تسلیم کرلیا گیا تھا کہ بیوہ جب اس کے متوفی شوہر کے بھائی اسکے خواستگار نہ ہوں تو عقد ثانی کرنے کی مجاز ہے اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ عورتوں نے تیسرا بیاہ تک کیا ہے جس کو تھرپوا کہتے ہیں۔

بیٹوں کی وراثت کے بارے میں دو رسمیں جاری تھیں۔ ایک تو چادر بند جو انجھا سکھوں میں زیادہ مروج تھا دوسرے بھائی بند جس کا رواج مالوا سکھوں میں تھا پہلے کے رو سے جائداد ماؤں پر مساوی حصوں میں تقسیم ہوتی تھی اور دوسرے کے لحاظ سے بیٹوں پر مساوی حقوق ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے دو بیوائیں چھوڑیں جن میں سے ایک کے ایک لڑکا اور دوسرے کے تین لڑکے ہیں۔ چادر بند کی رو سے پہلی بیوہ کے اکیلے لڑکے کو نصف حصہ ملیگا اور اس کے باقی تین سوتیلے بھائیوں کو فی بھائی چھٹا حصہ۔ بھائی بند کے لحاظ سے ہر لڑکے کو چوتھا حصہ ملیگا۔

شادی بیاہ کی ان بے قاعدہ رسوم کی پابندی اونچی ذات والوں یعنی برہمن وکھتریوں میں باوجود مذہب سکھ قبول کرنے کے نہیں ہے۔ یہ لوگ قدیم ہندو رسموں کے پابند ہیں لیکن باوجود اس کے قدیم مذہب کی پابند جماعت انھیں ذات باہر ہی تصور کرتی ہے اور اپنی لڑکی نہیں دیتے اِلّا اس صورت میں کہ ایک بڑی رقم بطور معاوضہ

---

[1] یہ فقرہ کیسا دل آزار ہے۔

دی جائے۔ ایسی صورتوں میں لڑکی والے اپنی لڑکی کو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ مرگئی ہے۔
لڑکیاں اور اُن کی اولاد ہر صورت میں مستحق توریث نہیں سمجھی جاتیں کیونکہ اگر ایسی توریث ایسے لوگوں میں جائز رکھی جائے جن میں لڑکی سنِ بلوغ پر پہنچنے کے ساتھ ہی بیاہ دی جاتی ہے تو جائداد کے اصل خاندان سے منتقل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

اونچی ذات کے سکھ سرداروں میں ستی یا بیوہ کا اپنے خاوند کی نعش کے ساتھ جلنے کا طریقہ جاری تھا ان لوگوں میں عورت کو عقد ثانی کا حق حاصل نہ تھا۔ بسا اوقات متوفی کی ملازمہ اور گھر بیٹھی آشنا کو بھی اس رسم کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو اس کی ایک رانی مہتاب دیوی اور اس کے زنانے کی تین عورتیں جن کا مرتبہ رانی کا تھا ان کے ساتھ جلائی گئیں۔ مہتاب[1] دیوی راجپوت اور راجہ سنسار چند کٹوچ کی ناجائز اولاد تھی۔ رنجیت سنگھ کے فرزند مہاراجہ کھڑک سنگھ کی نعش کے ساتھ اس کی چادر ڈالی ہوئی بیوی ایسور کور جو بڑی حسین عورت تھی جلائی گئی۔ وہ ستی ہونے پر رضامند نہ تھی اور کہا جاتا ہے کہ دیواں دھیان سنگھ نے اسے زبردستی جلوا دیا۔ رنجیت سنگھ کے پوتے نونہال سنگھ کی دو بیویاں اس کے ساتھ ستی ہوئیں۔

ان تمام واقعات میں سے دو آخری ستیاں پنجاب کے مشہور واقعات میں سے ہیں جن سے اس رسم کے حسن و قبح کا اظہار ہوتا ہے بالفاظ دیگر یا نہایت بے رحمی و سفاکی سے مذہب کے پردے میں ان کی قربانی کی گئی یا انھوں نے اپنی خوشی اور رضامندی سے جل کر جان دی اور اپنی وفاداری و جاں نثاری کا ثبوت دے کر نیکنامی کا تمغہ حاصل کیا۔

پہلا واقعہ ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ عیاش و شرابی جواہر سنگھ کو جو رانی جنداں کا بھائی اور ریاست کا دیوان تھا اہل فوج نے غصے میں آکر اس شبہے میں مار ڈالا کہ وہ خالصہ مذہب کے ساتھ بدعہدی کرتا ہے اور ان کا یہ شبہ درحقیقت ایک حد تک درست بھی تھا۔

---

[1] غالباً یہ رانی اپنی مرضی سے ستی ہوئی کیونکہ مغرور راجپوت عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ جلنے کے قبیح و ناگوار رسم کی پابندی کرنے کو اپنی شرافت کا تمغہ تصور کرتی تھیں۔ جب سجیت سنگھ مہاراجہ کشمیر کے دادا کا بھائی جو بڑا خوبصورت تھا لاہور میں مارا گیا تو اس کی دس بیوائیں اور اس کے محل کی تین سو آشنائیں ستی ہوگئیں۔ بعض لاہور میں۔ ایک سو پچاس رام نگر میں جہاں اس کا سر لایا گیا تھا اور باقی جموں یا اپنے اپنے مکانوں میں۔

لاہور کے قلعے کے باہر میدان میں اس کی نعش جلائی گئی - قرار پایا کہ اس کی چار بیوائیں بھی اس کے ساتھ جلائی جائیں - ان بدنصیب عورتوں نے اپنی جان بچانے کے لئے بہت التجائیں کیں لیکن ایک بھی قبول نہ ہوئی - چتا کا منظر بڑا دلخراش تھا - اہل فوج غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے اور ان میں ضبط و پابندی باقی نہ رہی تھی - ان لوگوں نے ان عورتوں کے بدن کے تمام زیور زبردستی اُتار لئے اور ناکوں میں سے نتھیں کھینچ لیں - ہندوؤں میں ستی کی بڑی حرمت مانی جاتی ہے اور اس کے آخری الفاظ پیشین گوئی تصور کئے جاتے ہیں - راجہ دینا ناتھ جو رانی کے قائم مقام کی حیثیت سے وہاں موجود تھا اور دوسرے اشخاص ان عورتوں کے قدموں پر گر کر دعا کے طالب ہوئے - ستیوں نے دینا ناتھ اور مہاراجہ کو دعا اور خالصہ فوج کو بددعا دی - جب پنجاب کی آیندہ قسمت کے بارے میں ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے یہ پیشین گوئی کی کہ سال بھر کے اندر ملک کی آزادی چھن جائے گی - خالصہ برباد اور فوج والوں کی عورتیں بیوہ ہو جائینگی - اس کے بعد وہ زبردستی آگ کے شعلوں میں جھونک دی گئیں لیکن ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ان کی بددعا ایسی پوری ہوئی کہ پہلے کبھی کوئی بددعا نہ پوری ہوئی ہوگی؛

ستی کا دوسرا واقعہ اٹاری کے سردار شام سنگھ کی بیوہ کا تھا - یہ شخص سکھوں میں بڑا شریف و نیک نہاد تھا - وہ سبراؤں کی جنگ میں کام آیا اس نے انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا اور اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا لیکن باوجود اس کے وہ خالصہ کی جانب سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا اور سبراؤں کی جنگ سے قبل کی رات کو اس نے گرنتھ پر ہاتھ رکھ کر اس امر کا عہد کیا کہ وہ میدان جنگ سے مغلوب ہو کر نہ پلٹیگا - صبح کے وقت وہ سفید لباس اور سفید مادیان پر سوار ہو کر لشکر کے روبرو آیا اور اپنے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر وہ خالصہ کے سپوت ہیں تو اپنی جان دیدیں لیکن شکست گوارا نہ کریں - جنگ کے ابتدائی حصے میں تو وہ ہر جگہ پہنچ کر سکھوں کی ہمت افزائی کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہزیمت یقینی ہے تو وہ خود تلوار لے کر پچاسویں رجمنٹ پر گھوڑے کو مہمیز کر کے جا پڑا اور فوج والوں کو اپنا ساتھ دینے کے لئے پکارتا رہا - تقریباً پچاس آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا لیکن وہ پسپا ہو کر ستلج میں ڈھکیل دیئے گئے اور شام سنگھ کے

سات گولیاں لگیں جس سے وہ ہلاک ہو کر سواری سے گر پڑا۔ لڑائی کے بعد اس کے خادموں نے اس کی نعش ڈھونڈنے کی اجازت طلب کی۔ بڈھے سردار کا اپنے سفید لباس و سفید لمبی داڑھی کی وجہ سے بآسانی پتہ چل گیا اور جس جگہ کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے وہیں اس کی بھی لاش ملی۔ اس کے نوکروں نے اس کی نعش کو ایک چوگھڑے پر رکھا اور اس کے ساتھ دریا میں پیر کر پار اتر گئے لیکن لاش تیسرے دن سے پہلے اس کے وطن اٹاری نہ پہنچ سکی۔ اس کی بیوہ نے جسے اس کے ارادے اور عزم بالجزم کا علم تھا کہ وہ شکست کھا کر زندہ نہ رہیگا اُس ملبوس کے ساتھ جو سردار نے شادی کے دن پہنا تھا اس کے آنے سے قبل جل کر جان دیدی۔ ستی کا یہ واقعہ پنجاب میں سب سے آخری تھا۔ جس مقام پر یہ واقعہ ہوا وہاں ایک ستون بطور یادگار بنایا گیا جو اب تک اٹاری کی چاردیواری کے باہر ایستادہ ہے۔

اولاد کا ناجائز ہونا اس کے توریث کی مانع سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اس نامہذب زمانے میں جب کہ زبردست کی مرضی ہی قانون سمجھی جاتی تھی ناجائز اولاد کو اکثر وہ رتبہ حاصل ہو جاتا تھا جس کے وہ از روے پیدائش مستحق نہ تھے۔ اس کے علاوہ کسی عورت پر چادر ڈالنے سے اس کی حیثیت جایز بیاہی ہوئی کی سی ہو جاتی تھی اس وجہ سے جایز و ناجایز اولاد میں امتیاز کرنا دشوار تھا قطع نظر اس کے ناجایز اولاد اور جائز و ناجایز آشناؤں ہی میں بھی مدارج تھے۔ لونڈی کی اولاد اس اولاد کے مساوی تصور نہ کی جاتی تھی جو کسی شریف عورت کے بطن سے پیدا ہوتی جو سردار کے گھر میں اس کی دلہن کے ساتھ آتی ہو۔

یک جدیوں کے توریث کے بارے میں بھی طرز عمل مختلف تھا لیکن عام قاعدے کے مطابق اس کی مخالفت کی جاتی تھی جیسا کہ کریوا طریقۂ ازدواج سے ثابت ہوتا ہے جس کے رو سے وہی شخص توریث کا مستحق ہوتا جو اپنے بھائی کی بیوہ سے شادی کرتا ورنہ اور کسی طرح اسے کوئی حق حاصل نہ ہوتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یکجدیوں کو کسی قسم کا حق دینے سے قطعی انکار کیا اور لوگوں کے اولاد ذکور نہ ہونے سے فوت ہونے پر بذات خود ان کی جائدادوں پر قبضہ کر لیا گو بعد میں بھاری رقم جرمانہ یا نذرانہ دینے پر جائدادیں کسی عزیز کے نام واگذاشت کر دی گئیں۔ ستلج اس پار کے زیر حفاظت ریاستوں میں انگریزوں کا طرز عمل بھی یہی۔ ہاں گر اس کے وجوہ ان اسباب سے زیادہ قوی تھے کیونکہ مالوا سکھ مانجھا سکھوں کے مقابلے میں دلّی کی حکومت کے زیادہ تر فرمانبردار تھے کیونکہ مانجھا سکھ

فاتح اور اپنے مقبوضات پر بلا مداخلت غیرے قابض تھے اور رنجیت سنگھ محض قزاق سرداروں میں زیادہ کامیاب بمصداق اندھوں میں کانا راجہ تھا اس قاعدے کے لحاظ سے سرکار انگریزی بعض بڑی بڑی ریاستوں پر قابض ہوگئی مثلاً بوریا - انبالہ - تھانیسر - دیال گڈھ رودور - مصطفیٰ آباد - فیروز پور اور کیتھل ۱۸۶۰ء میں سرکار انگریزی نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی اس طرح جائدادوں کو ضبط کرکے قبضہ کرنے سے دست بردار ہونے اور بڑے بڑے سرداروں کو تبنیٰ کرنے کا حق عطا کیا - یہ مسلمہ امر ہے کہ عموماً یہ طرز عمل دانشمندانہ تھا اور اس سے سرکار انگریزی کا اقتدار دیسی ریاستوں میں قوی و مستحکم ہوگیا لیکن بحث طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے سلوک میں افراط اور عمومیت نہ تھی اور آیا یہ امر زیادہ مناسب نہ تھا کہ تبنیت کی اجازت ایک معینہ میعاد تک سرکاری اعلیٰ خدمات کے صلے میں خاص رعایت کے طور پر دی جاتی اور ہر منفرد صورت میں حالات پیش آمدہ کے لحاظ سے اس کے جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا تصفیہ کیا جاتا بہ حالت موجودہ لارڈ کیننگ کے بلا تمیز عام طور پر تبنیت کی اجازت دیدینے سے سرکار کو گویا خداوند مجازی بنا دیا جس کی بخشش و عطا مستحق و غیر مستحق ہر ایک کے لئے یکساں ہے - اس طور پر وفاداری و جان نثاری کی بہترین جزا اور بغاوت و سرکشی کی سزا دینے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا ؂

باب چہارم

رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت پنجاب کی حالت

گرو گوبند سنگھ نے اپنے معتقدین کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ آخری گرو ہے ۔ اس کے مرنے پر جس کام کی انجام دہی اسے مقصود تھی اس کی تکمیل ہو چکی تھی یعنی سکھوں کی مغرور حریص و جنگجو جماعت قائم اور ان لوگوں کے دلوں میں مسلمان حملہ آور فاتحین اور آقاؤں کی جانب سے نفرت جاگزین ہو چکی تھی ۔ گرو کے دماغ نے خالصہ جماعت اس طرح پیدا کر دی تھی جس طرح کہا جاتا ہے کہ جوپیٹر دیوتا کے سر سے منروا پیدا ہوئی تھی ۔ یہ لوگ اب فتح حاصل کرنے کے لئے مسلح اور عام ساز و سامان سے آراستہ تھے ۔ صرف یکجہتی ۔ فوجی جذبے اور ہم مذہبی نے ان برگزیدگان شمشیر کو قوی بنا رکھا تھا ۔ مگر دشمن کے ہزاروں کے مقابلے میں ان کی تعداد محدود تھی اپنے مخالفین کے مقابلے میں جنھیں ہندوستان کے تمام وسائل پر اقتدار حاصل تھا یہ یہ لوگ کم مایہ اور کم حیثیت تھے ۔ سوائے مذہب ۔ بہادری و تلوار کے ان کے پاس کچھ نہ تھا اور سلطنت مغلیہ نے صرف اسی برتے پر وہ مصروف بیکار رہے ۔ اس سلطنت کے محاصل شاہ اورنگ زیب کے زمانے میں آٹھ کروڑ یا اس رقم کے دگنے تھے جو اب باوجود کثرت آبادی سرکار انگریزی کو حاصل ہوئے ہیں ۔ سکھوں کو خوش قسمتی سے شاہ اورنگ زیب کے تعصب نے بہت کچھ مدد دی کیونکہ اس کی وجہ سے ہر ایک ہندو باجگزار ریاست میں لوگ اس کے دشمن ہو گئے تھے اور بالآخر اسی سبب سے اس کی سلطنت عظیم پاش پاش ہو گئی ۔ خود مختاری جس کی بنا محض شخصی اوصاف پر ہو کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی ۔ ظلم کا خار دار شجر دانشمندی ۔ بے غرضی اور کرم گستری کا ثمر نہیں لاتا ۔ قسمت کے کھیل میں عام طور پر جہل ۔ ظلم اور تعصب کا پانسہ ایک خود مختار بادشاہی خاندان کے نام ہی نکلا کرتا ہے ۔ اگر اکبر اعظم کے مثل فرمارواؤں کا سلسلہ جاری رہ سکتا جو غالباً تمام اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے مشہور مطلق العنان حکمرانوں میں باعتبار فہم و فراست ذی شان اور فرد کامل تصور کیا جا سکتا ہے تو سلطنت مغلیہ آج بھی اُسی طرح سرسبز ہوتی اور انگریز تجار

تخت طاؤسی کے روبرو بعجز وانکسار شاہی نوازشوں کے اُسی طرح طالب نظر آتے جیسے کہ شروع زمانۂ سلطنت میں تھے۔ لیکن اورنگ زیب کا ناقابل برداشت تعصب جس کی ذات میں مذہبی امور سے قطع نظر کر کے بہت سی خوبیاں تھیں اور اس کی زندگی عیوب سے پاک تھی اپنے پیشرؤں اور جانشینوں کے اسراف سے زیادہ سلطنت کی بربادی کا باعث ہوا؛ اس کی ایذا رسانی سے سکھوں میں اپنے مذہب کے ساتھ وابستگی پیدا ہوگئی اور اذیت و موت کی تخویف نے ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ کیا۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ شہدا کا خون کشتِ مذہب کی سیرابی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ اورنگ زیب اس کی بیخ کنی پر تو قادر نہ ہو سکا۔ مگر اس کے مذہبی تعصب اور ناروا داری کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ سکھ مذہب کے پیرووں میں حرارت اور جوش مذہبی پیدا ہو گیا اور سکھوں کو اسلام سے ایسی سخت نفرت ہو گئی کہ جس کی چنگاریاں ابتک ان کے سینوں میں پوشیدہ ہیں اور اگر انگریزی حکومت آج اپنا دست راست اٹھالے تو پھر وہ شعلے آج ہی مشتعل ہو جائیں۔ دہلی نے اس حرارت کی چاشنی چکھی ہے اور ممالک مغربی و شمالی کے افغانوں نے بھی۔ اور اگر وسط ایشیا کے غازی ہندوستان کی تاخت و تاراج پر دیوانہ وار اٹھ کھڑے ہوں تو پھر وہی آگ بھڑک اٹھے گی؛

گرو گوبند سنگھ کی وفات سے لے کر رنجیت سنگھ کی پیدائش تک سکھوں کی تاریخ کا ذکر نہایت ہی مختصر الفاظ میں کیا جا سکتا ہے (خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ میں نے سکھوں کی ابتدا و خصائص و مذہب کے بارے میں اس سے قبل ذکر کر دیا ہے) تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کس قسم کے لوگوں پر مہاراجہ کی حکومت تھی اور ان کے عقائد کیا تھے جس کا منبعی حیثیت سے وہ قائم مقام تھا۔ مانجھا سکھوں کے متعلق ۱۷۰۸ء سے لے کر ۱۷۸۰ء تک ۷۲ سال کا تاریخی مواد کمیاب و ناقابل اعتماد ہے۔ لیکن جنوبی علاقے کے سکھوں کے متعلق ہمارے معلومات زیادہ ہیں اس زمانے کے اسلامی واقعات کا بیان مختلف و دلچسپ ہے۔ یہ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں اور سلطنت مغلیہ کے بتدریج انحطاط کے واقعات سے پر ہیں۔ جب کہ اس سلطنت کے صوبہ داروں نے بادشاہ کے اقتدار سے سبکدوش ہو کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا؛

گوبند سنگھ کا فوجی جانشین بندا تھا جس نے اورنگ زیب کے تین جانشینوں کے

زمانے میں بڑی مستعدی و تھوڑی بہت فوجی قابلیت کا اظہار کیا۔ شاہی فوج کو ایک سے
زیادہ موقعوں پر شکست دی۔ باری دوآب کے قطعۂ ملک کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر
۱۷۱۶ء میں اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ گرفتار و قید ہو گئے دہلی بھیجدیا گیا جہاں وہ
مختلف ایذا رسانیوں کے بعد قتل کیا گیا قتل کرنے سے پیشتر اسے اس امر پر مجبور کیا گیا کہ اپنے
لڑکے کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کرے۔ اس قطعی شکست کے بعد سکھوں کے حالات کا نادر شاہ
کے حملے کے زمانے تک کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ نادر شاہ کے دہلی پر بہ آسانی فتح پانے اور شہر
کی لوٹ مار سے سلطنت مغلیہ اس درجہ کمزور ہو گئی کہ سکھوں کی ہمت پھر بندھی اور وہ لڑائی
پر پھر آمادہ ہو گئے۔ ان کی نظر میں تمام مسلمان خواہ وہ ایرانی ہو یا افغان یا مغل یکساں قابل
تنفّر تھے اور انھوں نے بڑی سُرعت کے ساتھ یا تو نادر شاہ کی منتشر فوج پر حملہ کیا یا احمد شاہ ابدالی
کے لشکر کے ساز و سامان کو لوٹ لیا جو نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانستان کا مالک بن گیا
تھا اور ۱۷۴۷ء میں پنجاب پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس بادشاہ نے سکھوں کی دلجوئی کی اور وہ اس
بات میں خوش تھا کہ انھیں اپنا طرفدار بنا کر پہلے دہلی کی سلطنت کے خلاف اور پھر مرہٹوں
کے مقابلے میں جنھیں اس نے بعد میں شکست دی ان سے کام لیتا۔ لیکن سکھ اگرچہ مغلوں سے
تنفّر تھے لیکن افغانوں سے بھی انھیں کوئی اُنس نہ تھا اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ دہلی میں
ایک ایسی سلطنت قائم کرے جو اپنی ماقبل سلطنت سے زیادہ طاقتور ہو جو اپنی گردنوں میں
اس سے زیادہ مضبوط طوق غلامی ڈال لیں۔ سکھوں کی شہسواری۔ سادہ مزاجی اور
سُرعتِ نقل و حرکت نے انھیں مہیب دشمن بنا رکھا تھا اور گو انھوں نے مسلمانوں کی مرتب اور
بار ساز و سامان آراستہ فوجوں سے سخت اور متواتر شکستیں کھائیں لیکن ان شکستوں سے انکی
ہمت نہ ٹوٹی اور وہ صرف اس لیئے منتشر ہوتے تھے کہ دوسرے بار اس سے زیادہ قوت کے
ساتھ مقابلے پر آئیں۔ احمد شاہ نے جو اولوالعزم سردار تھا گو اس میں اجتماع و انتظام کی قابلیت
بہت کم تھی اور جس کے مفتوحہ مقامات بہت جلد اس کے قبضے سے نکل جاتے تھے کئی سال
تک مسلسل ہندوستان پر حملے کیئے۔ بعض اوقات وہ جنوب کے جانب دہلی تک بڑھتا چلا گیا
اور دوسرے موقعوں پر لاہور یا ستلج سے آگے نہ بڑھا۔ ہر موقع پر اسے سکھوں سے مقابلہ کرنا پڑا
جن کا اعتماد و قوت روبہ ترقی تھا اور جن میں ہمیشہ جتھہ یا مثل بندی ہوتی رہتی تھی جس کے
ذریعے سے قزاق سرداروں کا ایک گروہ جمہوریت و مساوات کے اصول پر کسی ایک

طاقتور پیشوا کے جھنڈے کے ساتھ شریک اور اس کے عام احکام کا پابند ہو کر لڑنے کا عہد کیا کرتا تھا۔ اس اجتماع نے انھیں اور مہیب بنا دیا۔ مختلف پیشواؤں نے اپنی بستیوں کی جگھوں پر قلعے تعمیر کر لیئے اور بتدریج پنجاب کے تمام میدان پر غالب آ گئے اور اس طور پر مسلمان صوبہ داروں کو ان کے قلعہ ہائے سرہند - دینانگر اور لاہور میں محصور کر دیا۔ لاہور پر انھوں نے دو مرتبہ قبضہ کر لیا اور عرصے تک اس پر قابض رہے - انھوں نے امرتسر میں متبرک مقامات کی از سر نو تعمیر کی اور نیر جل تالاب کو پھر بھر دیا - جب افغان بادشاہ پہاڑوں سے اتر کر سال بہ سال ہندوستان پر حملہ آور ہوتا تو سکھ اس کے روبرو سے ہٹ جاتے اور اس کے واپس ہوتے ہی غارتگری جاری کر دیتے اور جسے وہ عارضی طور پر اس کے آنے کی وجہ سے چھوڑ بیٹھے تھے پھر حاصل کر لیتے سکھوں کی تاریخ میں سنہ ۶۲-۱۷۶۱ء ایسا سال ہے جس میں سکھوں کی تاریخ میں ایک ایک تغیر عظیم واقع ہوا۔ اس کے مختصر واقعات اس وجہ سے قابل ذکر ہیں کہ خالصہ فوج پہلی مرتبہ ایک باقاعدہ فوج کے مقابلے پر آئی - اگرچہ انھیں شکست فاش نصیب ہوئی لیکن انھیں اپنے آپ پر اس قدر بھروسہ ہو گیا کہ دوسرے ہی سال انھوں نے سرہند کا صوبہ فتح کر کے اینروے ستلج ریاستوں کی مستحکم بنا قائم کر لی ؛

سنہ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ نے زین خاں کو سرہند کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ لیکن جوں ہی افغانوں نے وطن کی طرف مراجعت کی سکھوں نے تعداد کثیر میں مجتمع ہو کے زین خاں کو قلعے میں محصور کر دیا۔ اور اگر مالیر کوٹلے کے مسلمان پٹھان مدد پر نہ آ جاتے تو یقیناً سکھ قلعے پر قبضہ کر کے فوج کو تباہ کر ڈالتے احمد شاہ جب دوسرے سال ہندوستان آیا تو اس نے سکھوں کے سرہند پر حملہ کرنے کی گستاخی کی پاداش میں انھیں سزا دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ سکھ بڑنالے کے قریب جمع ہوئے تھے جو اس زمانے میں پٹیالے کا ایک بڑا شہر تھا اور اینروے ستلج کے سرداروں کے علاوہ مانجھا سکھوں کے اکثر پیشوا احمد شاہ کے آگے بڑھتے ہی ستلج عبور کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے - افغانوں کی نقل و حرکت ایسی عجلت کے ساتھ تھی کہ وہ سکھوں پر دفعۃً پہنچ گئے اور ان کو محصور کر کے لڑنے پر مجبور کیا - سکھوں کو شکست نصیب ہوئی ان کے بیس ہزار آدمی مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے جن میں پٹیالے کا سردار آلا سنگھ بھی تھا جس کی رہائی کے لیئے پانچ لاکھ معاوضہ طلب کیا گیا۔ بمشکل تمام یہ رقم ادا کی گئی - احمد شاہ نے جو بڑا ذی فہم تھا یہ سمجھ کر کہ سکھوں پر

اپنی طاقت کا بیّن ثبوت دینے کے بعد ان کی تالیف قلوب کرنا بڑی دانشمندی ہے آلا سنگھ سے بغلگیر ہو کر اسے خلعت اور راجہ کا خطاب عطا کیا؛

اس غیر معمولی اعزاز سے دوسرے سکھ سرداروں کے دل میں آلا سنگھ سے کاوش ورنجش پیدا ہو گئی اور انھوں نے یہ مشہور کیا کہ اس نے ان کے ساتھ دغا کی اور یہ خطاب اسی دغا کے صلے میں اسے دیا گیا ہے اور سکھوں کے لئے یہ امر باعث توہین ہے کہ وہ ایک مسلمان غیر ملکی اور دشمن کا دیا ہوا خطاب قبول کریں۔ یہ لوگ اپنی شکست کا انتقام اس سے ضرور لیتے لیکن سردار جسا سنگھ اہلو والیہ جو اس زمانے میں آلا سنگھ سے زیادہ با اثر شخص تھا اس کی طرفداری پر کمر بستہ ہو گیا۔ اس وقت تو بات رفع گذشت ہو گئی لیکن آلا سنگھ کے لئے یہ لازم ہو گیا کہ وہ اپنے افعال سے یہ ثابت کر دے کہ وہ درّانی بادشاہ کا محکوم نہیں ہے؛

احمد شاہ کے کابل واپس ہوتے ہی سکھوں کی ہمت پھر بڑھ گئی۔ ستلج کے شمال و جنوب کی ریاستیں پھر ایکبار باہمی تنازعات کو فراموش کر کے سرہند پر متفقہ کوشش سے دھاوا کرنے پر آمادہ ہو گئیں آلا سنگھ بھی بڑے جوش وخروش سے ان کا شریک ہوا۔ سرہند کے قرب وجوار میں سکھ مانجھا سے آ کر کثیر تعداد میں جمع ہوئے اثناء راہ میں انھوں نے لاہور کے جنوب میں قصور شہر و قلعے پر قبضہ کر لیا۔ مالوے کے سردار بھی آ ملے اور پوری فوج جو تقریباً سب کی سب سوار تھے تیئیس ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی۔ زین خاں صوبہ دار نے اس بھروسے پر کہ باقاعدہ فوج کا نظارہ سکھوں کے دلوں میں ویسی ہی دہشت پیدا کر دیگا جیسا کہ اس سے قبل ظاہر ہو چکا تھا فوج کو قلعے سے باہر لا کر لڑائی شروع کی لیکن وہ مارا گیا اور فوج کو شکست فاش ہوئی۔ سکھوں نے فوراً شہر پر قبضہ کر لیا اور اپنے گرو کے بچوں کے وہاں مارے جانے کے انتقام میں انھوں نے اسے لوٹ کر برباد کر دیا۔ سرہند کا صوبہ فاتحین پر تقسیم کیا گیا۔ سرہند شہر اور اس کے مضافات راجہ آلا سنگھ کو دئے گئے۔

احمد شاہ جب دوسرے سال آیا تو اس نے سرہند واپس لینے یا وہاں کوئی صوبہ دار مقرر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ واقعات موجودہ کے لحاظ سے آلا سنگھ کو سارا ضلع سالانہ خراج ادا کرنے پر دیدیا؛

اس طور پر سکھوں نے شکست و فتح دونوں حالتوں کے لحاظ سے ایسی حیثیت پیدا کر لی جو اس سے قبل انھیں حاصل نہ تھی اور اگر خانگی تنازعات دفع کر کے وہ باہم

متفق ہو جاتے جیساکہ سرہند کی فتح کے موقع پر ہوا تھا تو وہ بھی شمالی ہند میں اسی قدر مہیب و ناقابل دفع ہو جاتے جیسے جنوب و مغرب میں مرہٹے تھے۔ لیکن سکھوں کی جمہوریت پسندی نے جو لوگوں کے عام طبائع کے مطابق تھی ایسی تمام کوششوں کی مخالفت کی جس کی رو سے کوئی ایک شخص اس کا حاکم بن سکے اور مرکزی حکومت قائم ہو سکے یہاں تک کہ رنجیت سنگھ نے تمام مخالفتوں کا قلع و قمع کر کے رقیب و مخالف ہر دونوں کو ایک حالت میں لاکر مطیع کرلیا ؛

۱۷۶۲ء سے لے کر ۱۷۸۰ء رنجیت سنگھ کی پیدائش یا اس کے باپ مہان سنگھ کی وفات تک سکھوں کی تدریجی ترقی کے واقعات اور خود رنجیت سنگھ کے ۱۷۹۱ء میں سکرچاکیا کے مثل پیشوائی جانشینی کے واقعات جو اہم و دلچسپ ہیں دوسری کتابوں میں دیکھنا چاہیئے ؛

(۱) یہاں صرف سکھوں کے عام جتھ یا مثل بندی یا ریاستوں کے واقعات کی تصریح ضروری ہے اور یہ کہ کون اضلاع کس سردار کے قبضے میں تھے ؛

عام طور پر سکھوں کے بارہ مثلیں مانی جاتی ہیں اور گو یہ تعداد صحیح نہیں ہے اور بہت سی ایسی ریاستیں ہیں جو اس فہرست میں شامل کئے جانے کے قابل نہیں ہیں لیکن عام خیال کے مطابق میں نے اس کی پابندی کی۔ بہرحال میں نے ان کی ترتیب اس اہمیت کے لحاظ سے کی ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت انھیں حاصل تھی ؛

(۱) بھنگیاں	(۵) رام گڑھیا	(۹) سکرچاکیا
(۲) اہلووالیہ	(۶) سنگھ پوریا	(۱۰) دولی والہ
(۳) بھنگی	(۷) کرڑوڑا سنگھیا	(۱۱) نکئی
(۴) کنھیا	(۸) نشانیا	(۱۲) شہید

مذکورۂ صدر میں سے نمبر ۲۔۳۔۴۔۵۔۹۔۱۱۔ستلج کے شمال کے قطعات پر اور مابقی ۶ اس کے جنوب کے قطعات پر قابض ہیں۔ پھلکیاں کی مثل ان سرداروں کے

(۱) اس بارے میں صرف میری تصنیفات پنجاب کے سردار اور راجگان پنجاب میں اس زمانے کے واقعات کا بالتفصیل بیان کیا گیا ہے پہلی میں ستلج کے شمال کے مختلف مثلوں کے پورے واقعات رام گڑھی۔ بھنگی اور کنھیوں کے زیر عنوان مندرج ہیں اور اخیر میں پھلکیاں و اہلووالا مثلوں کے تاریخی حالات۔۔

جتھے پر مشتمل ہے جن کے آباؤ اجداد یکجدی تھے اور آجکل ان کے جانشین ان کی اولاد میں سے مہاراجہ پٹیالہ۔ راجگان جیندہ۔ نابھ و سرداران بھادور۔ ملوڑ اور بعض ان سے کم رتبہ سردار ہیں۔ سکھوں کی ابتدائی تاریخ میں اسے بہت کچھ اہمیت حاصل تھی لیکن باوجود خاندانی تعلق کے یا آنکہ اسی کی بدولت یہ مثل شاذ و نادر باہم مل کر کام کرتے اور جو موقعے اسے حاصل تھے ان سے بہرہ ور نہ ہوتی؛

اہلووالیہ خاندان کا بانی سادھو سنگھ ایک جاٹ کلال ذات کا تھا جو موضع اہلو میں آکر سکونت گزین ہوا اور اس پر اس کے خاندان کا نام پڑ گیا۔ لیکن اس اتحاد کا اصلی بانی سردار جسا سنگھ تھا جو سادھو کی پانچویں پشت میں تھا۔ یہ شخص گرو گوبند کے انتقال کے دس سال بعد ۱۷۱۸ء میں پیدا ہوا۔ اس نے رفتہ رفتہ بہت اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ نہایت قابل و کامیاب فوجی پیشوا تھا۔ دوسرے سرداروں کے مقابلے میں اس نے سکھوں میں یکجہتی پیدا کرنے کے متعلق سب سے زیادہ کوشش کی اور ۱۷۸۳ء میں جب وہ فوت ہوا تو اس وقت سکھ سرداروں میں وہ سب سے زیادہ باثر تھا اس کے مقبوضات زیادہ تر ستلج و بیاس کے مابین کے قطعات میں تھے؛

بھنگیوں کا نام ان کے مشہور و معروف سردار ہری سنگھ کے بھنگ نشے کے دلدادہ ہونے سے پڑا۔ سردار ہری سنگھ نے اپنے بھائی جھنڈا سنگھ اور گنڈا سنگھ کو ساتھ لے کر امرتسر کے ضلع کو اپنا صدر مقام بنایا اور آس پاس کے ملک میں لوٹ مار مچائی۔ ملتان کو فتح کیا اور کئی سال تک وہ اس پر قابض رہا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ابتدائی زمانے میں ہی ان کی قوت بالکل توڑ دی جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا؛

کنھیا بھی بھنگیوں کے طرح طاقت ور تھے۔ ان کے مقبوضات مدت تک ان کے قبضے میں رہے جس کی وجہ یہ تھی کہ رنجیت سنگھ سے ان کا ازدواجی تعلق تھا۔ ان کے سردار جے سنگھ نے اپنی شیر خوار پوتی مہتاب کور رنجیت سنگھ کو بیاہ دی تھی۔ اور رنجیت سنگھ خود اس وقت چھ سال کا تھا۔ ۱۷۸۹ء میں جب جے سنگھ مر گیا تو اس کی بہو سدا کور نے جو مہتاب کور کی ماں تھی اور بڑی قابل لیکن بدچلن تھی ریاست کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے داماد کے خلاف ۱۸۲۰ء تک مقابلے میں جمی رہی۔ کنھیوں کے مقبوضات امرتسر و گرداسپور کے اضلاع وسیع قطعات پر مشتمل تھے۔ اس خاندان کی

دوسری عورت رانی چند کور نے جس کی شادی کھڑک سنگھ سے ہوئی تھی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا اکلوتا بیٹا تھا سدا کور کی سی زندگی بسر کی۔ ان دو سازشی عورتوں کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سکھوں میں نانک و گوبند کی آزادانہ تعلیم کی بدولت عورتیں کس درجہ ذی اثر ہوا کرتی تھیں ؛

رام گڑھیا مثل کنھیا مثل کے ساتھ امرتسر کے متبرک شہر اور اس کے گردونواح کے اضلاع پر متصرف تھی اپنے عروج کے زمانے میں وہ آٹھ ہزار فوج میدان جنگ میں لاسکتی تھی۔ سردار جسا سنگھ جو اس کا نامور سپہ سالار تھا ۱۷۵۸ء میں اس کا پیشوا بنا۔ اس نے پہلے امرتسر کی قلعہ بندی کی۔ اس کے اردگرد مٹی کے اونچے اونچے دھس بنائے گئے اور اس کا نام رام روتی یا خدائی قلعہ رکھا۔ ادینا بیگ نے اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد حملہ کر کے اسے برباد کر دیا۔ یہ شخص جالندھر دوآب میں شاہ دہلی کی جانب سے صوبہ دار تھا۔ اس کے مرنے پر جسا سنگھ نے قلعے کی از سر نو تعمیر کی اور اس مرتبہ اس کا نام رام گڈھ رکھا جس نام سے اس کی ریاست موسوم ہوئی ؛

یہ شخص مشہور جنگجو امیر تھا۔ اس نے بڑی مہمیں سر کیں اور دہلی کی چار دیواری تک لوٹ مار کرتا پہنچ گیا۔ ایک موقع پر یہ ناف شہر میں جا پہنچا اور مغلوں کی بستی میں سے ۴ توپیں اٹھا لے گیا میرٹھ کے صوبہ دار نے اسے خراج ادا کیا ؛

سنگھ پوریا کی ریاست ایک زمانے میں بڑی طاقتور تھی اور جسا سنگھ اہلو والیہ۔ پٹیالے کے آلا سنگھ کے زمانے سے قبل اس کا بانی سردار کپور سنگھ سکھ اُمرا میں سب سے زیادہ بااثر شخص مانا جاتا تھا۔ یہ شخص نواب کے نام سے مشہور تھا۔ سکھوں کے مخصوص اسلامی خطاب اختیار کرنے کی یہ ایک نادر مثال ہے۔ اس نے امرتسر کے قریب موضع فیض اللہ پور کو فیض اللہ خاں سے چھین کر اس کا نام سنگھ پورہ رکھا اور اسی نام پر مثل کا نام پڑ گیا گو اسے اکثر فیض اللہ پورہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سردار ۱۷۵۳ء میں فوت ہوا اور جسا سنگھ اہلو والیہ بلحاظ اقتدار و اثر اس کا جانشین ہوا گو ملک پر اس کا بھتیجا خوش حال سنگھ اور اس کی اولاد قابض رہی اس ریاست کے زیر تصرف لدھیانہ۔ نور پور۔ جالندھر اور ضلع انبالے کے شمالی مغربی قطعات تھے ؛

کروڑ سنگھی جس کا نام سردار کروڑا سنگھ کے نام پر ہے دریائے جمنا و مکندا کے

مابین قطعات پر قابض تھے۔ کلیسا کا زبردست خاندان اس مثل کا اصلی رکن تھا اور اب تک اینروے ستلج میں اس کی حکومت قائم ہے۔ اس کے علاوہ سردار بھگیل سنگھ کا خاندان بھی تھا لیکن اب وہ بالکل مٹ چکا ہے۔

نشانیہ یا وہ لوگ خالصے کے نشان یا جھنڈا اُٹھاتے تھے کبھی زیادہ موقّر نہ سمجھے گئے۔ سردار جے سنگھ نے جو اس ریاست کا سب سے بڑا شخص تھا ۱۷۶۳ء میں سرہند کی فتح کے بعد جائداد حاصل کی اس مثل والوں کا قبضہ انبالہ۔ لدران۔ شاہ آباد۔ املوہ اور دوسرے اضلاع میں تھا۔

سکرچاکی اپنے اصلی مقبوضات کی مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے مشہور ہیں کہ ان کا آخری قائم مقام مہاراجہ رنجیت سنگھ تھا۔ ان کے حالات مہاراجہ کے حالات کے ضمن میں بیان کئے جائیں گے۔

دولی والی ریاست کا نام سردار تارا سنگھ کے موضع کے نام پر رکھا گیا جو اس کا اصل پیشوا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جالندھر کے بالائی دواب اور انبالہ اور لدھیانے کے شمالی حصوں اور فیروزپور کے بڑے حصوں پر قابض تھا۔ نکائی اس ملک میں سکونت گزیں تھے جو نکا کے نام موسوم ہے اور لاہور وگجیرا کے مابین ملتان کی سمت میں واقع تھا۔ ریاست کبھی طاقتور نہ تھی لیکن لڑائی کے موقعے پر دو ہزار سوار۔ اونٹوں کی قطار اور چند توپیں میدان جنگ میں لا سکتی تھی۔ پنجاب کے اس حصے کے جاٹ اپنی بہادری میں مشہور ہیں اور سردار ہیرا سنگ ورام سنگھ کی ماتحتی میں انھوں نے نو لاکھ مالیت کی جاگیر گجیرا و مشرق پور میں حاصل کر لی تھی۔

شہید مثل جوان ریاستوں میں سب سے آخر تھی فوجی جماعت سے زیادہ ایک مذہبی جتھے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں پجاری بھی دوسرے دنیادار لوگوں کی طرح لڑا کرتے تھے۔ خالصہ جماعت مذہبی جنگ آزماؤں کا ایک حقیقی اور اصلی گرو شہید مثل کا بانی سدّا سنگھ تھا جو تلونڈی کے مندر کا مہنت یا پجاری تھا۔ جہاں گرو گوبند نے قیام گاہ یا دمدمہ بنایا تھا۔ جالندھر کے مسلمان صوبہ دار سے لڑتے ہوئے وہ مارا گیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ باوجود سر کٹنے کے گھوڑے پر سے گرنے کے قبل کچھ دور تک سوار اور دشمنوں کو قتل کرتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔ اسی بناء پر اسے شہید کے لقب سے

موسوم کیا گیا اور اس کے پیرووں کا یہی نام پڑ گیا۔ ریاست بطور خود لڑنے کے بجائے دوسروں کے شریک حال ہو جاتی تھی۔ رانیا۔ کھتری اور رجرولی کے قرب وجوار میں اس نے املاک حاصل کی۔ اور اس کے جانشین اب بھی دمدمے کے مندر کے متولی ہوتے ہیں ؀

یہ ہے مرقع سکھوں کی ان جنگجو ریاستوں کا جو اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں قائم تھیں لیکن ان کی ترکیب ہمیشہ تبدیل ہوتی رہی اور ان کے مقبوضات جلد جلد ایک دوسرے کے پاس منتقل ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ آپس میں اس سے زیادہ لڑتے تھے جیسے کہ اپنے عام دشمن مسلمانوں سے لڑا کرتے تھے۔ ان کی باہمی جنگ کا خاتمہ رنجیت سنگھ نے اس طور پر کردیا کہ جو ریاستیں انگریزوں کے زیر حفاظت نہ تھیں انھیں بالکل نیست و نابود کردیا۔ خود ریاستوں کے حدود کے اندر امرا میں باہم لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور کبھی ایک کے اور کبھی دوسرے کی طرف سے اس کی ابتدا ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سکھ مذہب کی ترکیب تھی جس کی رو سے کسی قسم کی متابعت یا محکومیت تسلیم نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان کے مذہب کا اصول اخوّت تھا اور سکھوں کو یہ غرّہ تھا کہ وہ آزاد سپاہیوں کا ایک جتھا ہیں یہ زمانہ خالصہ کی کم عمری و امنگ کا زمانہ تھا اور کسی فرد واحد کو کوئی غیر معمولی قوت و طاقت حاصل نہ تھی۔ ایسی حالت میں آزادی کا خیال حقیقت سے بعید نہ تھا۔ لیکن جس قدر بڑے سرداروں کی قوت میں بتدریج ترقی ہوتی گئی اُسی قدر ان کے چھوٹے چھوٹے پڑوسی اس امر پر مجبور ہوتے گئے کہ دوسروں کی دست بُرد سے محفوظ رہیں یا خود ان ریاستوں میں ضم ہونے سے بچنے کے لئے کسی ایسے پیشوا کے زیر حفاظت ہوں جو ان کی حفاظت کرسکے اور اس کے معاوضے میں وہ میدان جنگ میں اس کی خدمت کریں ؀

اس زمانے میں سکھ سردار اپنے تابعین سے بجز ایک گھوڑے اور بندوق کے اور کوئی مطالبہ نہیں کرتے تھے اور جو شخص ان کا تابع ہوتا وہ صرف ان کی حفاظت اور اس اجازت کا خواستگار ہوتا کہ خدا اور گرو کے نام پر اس سردار کے جھنڈے تلے رہ کر لوٹ مار کرنے کا موقع اس کو دیا جائے۔ تنخواہ کی کوئی بحث ہی نہ تھی۔ تمام سکھ اصولاً مساوی تھے۔ ہر سکھ جو امر سنگھ مجیٹھیہ کی طرح تیر کو درخت میں آرپار چھید سکے یا ہری سنگھ نلوا کی طرح

شیر کو ایک ضرب تیغ میں ہلاک کر سکے اپنے آپ کو سردار کہلانے کا مستحق تھا اور ایک جماعت تابعین کی قائم کر لیتا تھا۔ ایک وقت وہ آیا کہ سکھوں نے بھی یہودیوں کی طرح اپنا بادشاہ مقرر کیا اور ایک حد تک مساوات کے خواب کو بھول گئے جو انھیں کسی زمانے میں بہت عزیز تھا ؎

لیکن ستلج کے شمال وجنوب کے تمام بڑے خاندانوں کی ابتدا ایک ہی سی ہے۔ جس طرح درحقیقت دنیا کی تمام طاقتور جماعتیں قائم ہوئی ہیں اسی طرح سکھوں کی جماعت کی بنیاد بھی قوت کے قانون۔ تلوار کی دھار اور قوت بازو پر تھی۔ ہر سکھ سردار کی بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنی طاقت وکامیابی کی بنا پر تابعین کو اپنی جانب رجوع کرے۔ اگر ایسے تابعین لڑنا اور سواری جانتے تھے جن سے ہر سکھ آشنا تھا تو اس کی کوئی پروا نہیں کی جاتی تھی کہ وہ کون ہیں اور ان کی گزشتہ زندگی کے حالات کیا ہیں۔ اس زمانے میں ہر گانوں قلعہ بنا ہوا تھا جو اونچے ٹیلے پر بسا ہوتا تھا تاکہ گرد واطراف کے میدان پر نظر پڑ سکے۔ گانوں میں داخل ہونے کے لئے صرف ایک راستہ ہوتا تھا اور گلیاں ایسی تنگ ہوتی تھیں کہ دو آدمی بہ مشکل پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ پڑوسی کا لفظ دشمن کا مترادف سمجھا جاتا تھا اور کاشتکار ہل جوتنے کے وقت بندوق اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کوئی شخص اپنی زمین۔ گھوڑا یا بیوی اس وقت تک محفوظ نہ سمجھتا تھا جب تک کہ خود اس میں ان کی حفاظت کرنے کی طاقت نہ ہو کیونکہ گو سکھ پیشوا مسلمانوں کو لوٹ مار کرنے اور شاہی محافظوں کے گرفتار کرنے سے بہت خوش ہوتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ وطن دوست ہونے سے زیادہ قزاق تھے اور بلا کسی لحاظ یا رورعایت کے لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک امر میں ان کی تعریف کی جا سکتی ہے اور یہی چیز ان کو وسط ہند کے پنڈاریوں اور آجکل کے ڈاکوؤں سے ممیز کرتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ انسانوں کی طرح لڑتے اور لوٹ مار کرتے تھے اور ایسے موقعوں پر یہ عفریت نہ بن جاتے تھے سکھوں کی تاریخوں میں بہت کم ایسے واقعات نظر آئینگے جن میں عورتوں کی آبروریزی اور مردوں کو اذیت پہنچائی گئی ہو جیسے ظلم وستم کے واقعات سے جنوبی ہند کی تاریخ کے صفحات آلودہ ہیں ؎

یہ سچ ہے کہ لڑائی میں بہت سی خوبصورت جاٹ لڑکیاں گرفتار کی گئیں لیکن وہ خود گرفتار کیئے جانے پر رضامند تھیں۔ انھیں چھٹپنے ہی سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ خاوند کے

اوصاف صرف یہ ہیں کہ وہ شجاع وطاقتور ہو۔ اور وہ خاموشی سے اپنے آپ کو بطور انعام اسی شخص کے حوالے کر دیتی تھیں جس نے میدان جنگ میں لڑ کر انھیں جیتا ہو اور بعد میں ان کو اپنی جائز بیوی بنالے گو اس نے ان کے بھائیوں کو قتل اور ان کے گانوں کو آگ لگادی ہو۔

لیکن اگرچہ سکھ بلاشبہ قزاق تھے اور جس طرح اسکاٹ لینڈ کے سرحد پر سو سال پہلے ہوا کرتا تھا مویشیوں کی چوری ان کے ہاں ایک نہایت معزز پیشہ شمار ہوتا تھا لیکن بہرحال ان کا دینی جوش اور مسلمانوں سے تنفر جنھوں نے عرصے سے انھیں پامال کر رکھا تھا اور ان کے پیشواء مذہب کو قتل اور ان کی قربان گاہوں کو مسمار کر دیا تھا۔ اس سے ان کو ایک خاص قسم کا وقار حاصل ہو گیا تھا اور ان کے اغراض و فوجی جہمات میں تقریباً قومی رنگ پایا جاتا تھا؛

سکھوں کی فوج دل خالصہ (خدائی فوج) یا بعض اوقات بدھادل (آزمودہ کار فوج) کے نام سے موسوم کی جاتی تھی اس میں زیادہ تعداد سواروں کی ہوتی تھی جو کٹیا وند کہلاتے تھے اور جو اپنی سواری کے گھوڑے خود مہیّا کرتے تھے اور مال غنیمت سے ان کو دوہرا حصہ ملتا تھا ہر سردار اپنے وسائل آمدنی کے لحاظ سے اپنے تابعین کے لیئے جو بارگیر کہلاتے تھے گھوڑا اور ہتیار مہیا کیا کرتا تھا اور کیونکہ مفتوحہ ملک سے سب سے پہلے خراج میں گھوڑے ہی وصول کیئے جاتے تھے۔ اس لیئے بسا اوقات سپاہی لڑائی کے فتح ہونے پر عموماً سوار بن جاتے تھے۔ پیادہ فوج تمام فوج میں کم رتبہ سمجھی جاتی تھی اور صرف قلعوں کی محافظت اور چھاؤنیوں کی نگہبانی پر مقرر کی جاتی تھی۔ لڑائی میں سکھ ہمیشہ سوار فوج سے کام لیتے تھے۔ صرف اکالیوں کی پیادہ فوج کی وقعت کی جاتی تھی۔ یہ معتقدین کی ایک فدائی جماعت تھی جو گہرے نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے اور پگڑیوں میں اپنے چکر لگایا کرتے تھے جو کچھ تو خوبصورتی کے لیئے اور کچھ ہتیار کا کام دیتے تھے گو وہ زیادہ موثر ثابت نہ ہوتے تھے؛

ان کی دوسری امتیازی علامت یہ تھی کہ پگڑی میں چاقو کھسا ہوا ہوتا تھا۔ گردن میں تلوار لٹکی ہوئی اور ہاتھ میں ایک چوبی عصا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھنگ کے نشے میں چُور جوش میں آکر سب سے پہلے شہروں پر دھاوا کرتے اور بسا اوقات کارہائے نمایاں انجام دیتے تھے۔ لیکن یہ بالکل بے تربیت اور ناقابل اعتماد تھے اور صلح کے زمانے

میں تو ان کی آزادی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ سکھوں کا ہتھیار تلوار تھی جس کے استعمال میں سوار خصوصاً مشاق تھے۔ پیادہ فوج تیر کمان اور بہت کم بندوق سے کام لیتی تھی لیکن بارود بہت کم دستیاب ہوتی اور سکھ اس کے استعمال کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے اور عموماً بندوق پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کو خوف معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان میں توپ خانہ نہ تھا۔ گو رنجیت سنگھ نے فرانسیسی اور اطالیہ کے عہدہ داروں کی امداد سے بہت زبردست و باقاعدہ توپ خانہ قائم کیا تھا تاہم آخر وقت تک سکھ اس خدمت سے متنفر رہے اور مسلمان عموماً اس کام پر مامور کیئے گئے۔ مال غنیمت عموماً مساوی طور پر تمام سپاہیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص محروم ہوتا تو اس کو معاوضہ دیا جاتا اور مقتول کے فرزند یا قریبی رشتہ دار کو اس کی جگہ مامور کیا جاتا تھا۔

سردار یا امرا اپنے خاندانی ناموں سے مشہور ہوتے تھے اور یہی ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتے تھے کیونکہ ہندو ناموں کی تعداد کم تھی اور سنگھ کا لقب عام تھا عموماً یہ اضافہ یا تو جائے پیدائش کے لحاظ سے ہوتا تھا یا اس شہر کے نام پر جسے انھوں نے فتح کیا ہو مثلاً جسا سنگھ اہلو والہ۔ بعض اوقات ذاتی خصوصیت و اوصاف کے لحاظ سے خواہ وہ اچھے ہوں یا برے مثلاً دان سنگھ پنج ہتہ (پانچ ہاتھ والا بلحاظ قوت جو میدان جنگ میں ظاہر ہوتی تھی) لہنا سنگھ جھبنی (پستہ قد ہونے کی وجہ سے)۔ بھر سنگھ لمبا (دراز قد) شیر سنگھ کملا (بیوقوف) کرم سنگھ نرملا (بے عیب) اور اسی طرح کے سیکڑوں نام جن سے سکھوں کی تاریخ بھری پڑی ہے اور جو آج تک خاندانی نام کی حیثیت سے باعث افتخار متصور کیئے جاتے ہیں۔

باب پنجم

مہاراجہ

کوئی سیاح پنجاب میں جاکر مہاراجہ کی شکل و شمائل اور خصوصیات سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ اس کی وفات کو نصف صدی کی مدت گزر چکی ہے پھر بھی صوبے بھر میں اس کا نام گھر گھر زبان زد ہے اور بڑے بڑے محلّوں سے لے کر جھونپڑیوں تک میں اس کی تصویریں لٹکائی جاتی ہیں۔ امرتسر و دہلی کے نقاش ہاتھی دانت پر اس کی تصویر بنایا کرتے ہیں۔ ان تصاویر میں وہ ادھیڑ یا سن رسیدہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے شباب یا جوانی کی تصویر بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ ابتدائے لاہور کے دربار میں نقاشی اور دوسری عمدہ صناعیوں کی کچھ ایسی قدر نہ تھی۔ بڑھاپے میں رنجیت سنگھ کی تصویر کچھ خوش نمانہ تھی لیکن اوس کی صورت میں کوئی ایسی بات تھی جسے کوئی بھول نہیں سکتا تھا۔ سخت محنت اکثر معرکۂ جنگ کے ہنگاموں میں جان جوکھوں کے موقعوں پر موجود رہنے۔ شراب خواری و عیاشی نے اسے قبل از وقت بڈھا کردیا تھا اور پچاس سال کی عمر میں وہ بوڑھا اور ضعیف بیکار اور مضمحل ہوگیا تھا؛

اُسی زمانے کے بہت سے لوگوں نے اس کا حلیہ بیان کیا ہے اور منجملہ بیرن ہیوگل کا بیان ہے جو یہاں لکھا جاتا ہے صحیح اور ہوبہو ہے؛

وہ کوتاہ قد اور کم رُو تھا اور اگر وہ اپنی اعلیٰ ذہانت و قابلیت سے ممتاز نہ ہوگیا ہوتا تو کوئی نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا۔ میں بلامبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب میں میں نے اس سے زیادہ کوئی بدصورت اور کم رُو شخص نہیں دیکھا۔ اس کی بائیں آنکھ سے جو بالکل بند ہے اس کی دہنی آنکھ نے اس کی صورت زیادہ بگاڑ دی ہے جو ہمیشہ غلّہ سی کھلی اور پھرتی رہتی ہے اور بیماری کی وجہ سے اور بھی بھیانک اور ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ہر داغ ایک علیحدہ گڑھے کی صورت میں اس کے کلجھویں گندمی رخسار سے پر نمودار ہے۔ اس کی چھوٹی سیدھی ناک آگے سے موٹی ہے۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ دانتوں سے ملے ہوئے ہیں۔ مگر دانت اب تک اچھے ہیں۔ اس کی

کر بڑی ڈاڑھی کلّوں پر اور مونچھ گھنی تھیں ٹھڈّی کے نیچے دونوں گندھی ہوئی ہیں۔ اس کا سر جو چوڑے شانوں میں سے بالکل دھنسا ہوا ہے اس کے قد کی مناسبت سے بڑا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بہ آسانی جنبش نہیں کرسکتا۔ اس کی گردن موٹی اور پُر گوشت ہے۔ اُس کے بازو اور ٹانگیں دُبلی ہیں۔ بایاں ہاتھ اور پاؤں دونوں جھولا مارے ہوئے ہیں ہاتھ چھوٹے اور مضبوط ہیں بعض اوقات وہ آدھ آدھ گھنٹے تک کسی اجنبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیئے رہتا اور اس کے دلی اعصابی ہیجان کا اظہار اس کی انگلیوں پر علی الاتصال دباؤ پڑنے سے اسی شخص پر ہوتا رہتا ہے۔ اس کا لباس اس کی بدصورتی کو بڑھا دیتا ہے۔ موسم سرما میں سر کی پگڑی سے لے کر پاؤں کے موزے اور زیر پائی تک وہ زرد رنگ کا لباس پہنتا تھا۔ جب وہ معمولی انگریزی وضع کی کرسی پر پالتی مار کے بیٹھتا تو یہ نشست اس کے لیئے اور بھی ناموزوں ہوتی ہے لیکن جب وہ گھوڑے پر بیٹھکے اور سیاہ ڈھال پشت پر ڈال کر سوار ہوتا ہے تو اس کی شکوہ تمام نمایاں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اوس کی روح نے قالب کو زندہ کر دیا ہے۔ اس وقت ایک خاص شان نکلتی ہے جبکا وہم بھی نہ تھا کہ وہ ایسا ہے۔ باوجودیکہ اس کا ایک پہلو مفلوج ہو چکا ہے مگر پھر بھی وہ گھوڑے کو نہایت آسانی سے قابو میں رکھتا ہے۔

یہ دل میں کھپ جانے والی شبیہ کچھ ایسی دل آویز نہیں ہے۔ سنہ ۱۸۳۴ء میں رنجیت سنگھ پر فالج گرا۔ لیکن اس واقعے کے قبل اگرچہ وہ کوتاہ قد تھا اور اس کا چہرہ اس منحوس بیماری (چیچک) کی وجہ سے بدرونق ہو گیا تھا جو بسا اوقات پنجاب کو خالی کر جاتی تھی اور اب بھی باوجود ٹیکہ لگائے جانے کے لوگ اُس کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ سپاہگری میں فرد کامل۔ مضبوط۔ اکہرے بدن کا۔ چُست و چالاک۔ بہادر اور جفاکش شخص تھا۔ وہ بڑا شہسوار تھا اور دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر رہنے کے بعد بھی کبھی تھکن کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں نہ ہوتے تھے۔ گھوڑے کا اس کو اس قدر شوق تھا کہ یہ شوق عشق کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا اصطبل نہایت وسیع تھا جس میں ہندوستانی عربی اور ایرانی نسل کے جانور جمع تھے اور جو اُس کے خاصے کے تھے۔ وہ بڑا شوقین شکاری تھا اور شمشیرزنی کے فن میں اُستاد تھا۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں اس نے روپڑ کے مقام پر اپنے اور سکنر کے سواروں کا میخ اکھاڑنے اور تلوار لگانے کے کرتبوں میں مقابلہ کیا اور کامیاب رہا۔ اس کا لباس

بالکل سادہ ہوتا تھا۔ موسم سرما اور موسم بہار میں وہ عموماً زعفرانی رنگ کی کشمیر کی جامہ وار پہنا کرتا تھا اور گرمیوں میں سفید ململ کا لباس۔ وہ کسی قسم کے زیور و جواہر استعمال نہ کرتا تھا بجز خاص تقریب یا دربار کے موقعوں کے۔ اس قسم کی سادگی اکثر ایسے دیسی والیان ملک و مدبران سلطنت میں پائی جاتی ہے جو دماغی قابلیت میں ممتاز ہیں۔ یورپین اشخاص کی طرح وہ بھی وحشیوں اور عورتوں کے مانند بناؤ سنگھار کرنے کو ناپسند کرتے ہیں اندور کے مہاراجہ تکاجی راؤ ہلکر۔ راجہ سر ڈنکر راؤ اور ریاست نظام کے وزیر اعظم سر سالار جنگ عادتاً اپنے معمولی ملازمین کی طرح سادہ لباس پہنتے تھے۔ لیکن رنجیت سنگھ کو زیور اور جواہر کے استعمال کی ضرورت اپنے امتیاز ظاہر کرنے کے لئے نہ تھی۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ باوجود کمزوری اندھے پن اور مفلوج ہونے کے اپنے ذی شان مہیب اور سرکش اُمرائے دربار پر اسے پوری پوری فوقیت حاصل تھی۔ فقیر عزیز الدین سے جو ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے پاس شملے سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا ایک انگریز عہدہ دار نے دریافت کیا کہ مہاراجہ کس آنکھ سے کانا ہے۔ فقیر کے جواب سے اس کے دربار کی عظمت و شان اور درباریوں کے دل میں اس کی توقیر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ "مہاراجہ کے چہرے پر ایسا رعب و دبدبہ ہے کہ میں نے کبھی نظر بھر کے اس کے چہرے کو نہیں دیکھا کہ معلوم کر سکوں کہ وہ کس آنکھ سے اندھا ہے"۔

مہاراجہ میں بعض نہایت نمایاں اور مخصوص عظمت کے نشان وہبی طور پر پائے جاتے تھے اور عام اخلاقی اصول و مستحسن طریق زندگی کے لحاظ سے اخلاق سے عاری تھا۔ اس کی فطرت میں درحقیقت وہ کمزوریاں اور عیب حد درجے کے موجود تھے جن کا نشو و نما انسان کے دل و دماغ میں اسی طرح ہوتا ہے جس طرح خود رو گھاس پھوس۔ اس کی اخلاقی زندگی بادی النظر میں بھی اس کی ظاہری جسمانی ہستی کی طرح حقیر اور کریہہ تھی وہ خود غرض۔ جھوٹا اور حریص تھا وہ توہمات میں شدت سے مبتلا تھا اور علانیہ بے شرمی کے ساتھ شراب خواری و عیاشی کرتا تھا۔ اوصاف حمیدہ میں اسے کوئی حصہ نہیں ملا تھا لیکن باوجود اس کمی کے وہ بڑا شخص تھا۔ اس میں دوسرے بڑے حکمرانوں کی طرح جیسے قیصر۔ سکندر اعظم سے لے کے نپولین بوناپارٹ تک دماغی قابلیت کے ساتھ اخلاقی خوبی کی آمیزش نہ تھی۔ وہ اس وجہ سے بڑا تھا کہ اس میں غیر معمولی طور پر وہ اوصاف پائے جاتے تھے جن کے بغیر اعلیٰ درجے کی

کامیابی حاصل ہونا ناممکن ہے۔ ان اخلاقی خوبیوں کے نہ ہونے سے جو عائشہ خلائق میں پائی جاتی ہیں اس کے ممیز خصائل میں نہ تو کوئی خلل واقع ہوا نہ کچھ کمی۔ وہ پیدائشی فرماں روا تھا اور اُس میں حکومت کرنے کا مادہ قدرت نے ودیعت رکھا تھا۔ لوگ بے چون وچرا اس کی اطاعت کرتے تھے کیونکہ اس سے سرکشی کرنے کا کسی کو مقدور نہ تھا۔ جو داب اس نے اپنے مرتے وقت تک امرا اہلکاری اور سکھوں کی عام جماعت پر قائم رکھا تھا اس سے اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے؛

انتہائی جُرات و بہادری کے ساتھ اس میں استقلال اس بلا کا تھا کہ کسی مزاحمت سے اُس کے قدم کو لغزش نہ ہو سکتی تھی اور اسے مہمات میں ناکامیابی اس وجہ سے کبھی نہ ہوتی تھی کہ ناکامی کے امکان کا بھی اس کے دل میں کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ اس کی سیاسی دانشمندی بہت بڑھی ہوئی تھی اور اس کا بیّن ثبوت اس سے زیادہ کسی امر سے نہیں ہو سکتا کہ جب اس نے دیکھا کہ انگریزوں کی دوستی سے ہر طرح کا امن اور دشمنی سے بہت خوف ہے تو وہ ان کی دوستی پر آمادہ ہو گیا۔ باوجود قوی ترغیبوں کے اور باوصف انگریزوں کی نہایت درشتی سے مزاحمت کرنے کے جس سے اُس کی ستلج اس پار کے ممالک کو فتح کرنے کی دلی تمنا بر نہ آئی تاہم اپنے دوران حکومت میں انگریزوں کے ساتھ اس نے رابطۂ اتحاد مستحکم اور مضبوط رکھا اور اس کی اس قدیم دوستی کا اثر اس کے مرنے پر بھی ایسا مضبوط رہا کہ مہاراجہ شیر سنگھ سا کمزور و شرابی راجہ بھی پنجاب میں شورش برپا ہونے اور افغانستان میں انگریزی فوج کی بربادی کے نازک وقت میں وفادار رہا۔ اس میں اور وصف ایسا تھا جو اکثر طباع اشخاص کے خصوصیات میں شمار ہوتا ہے۔ اور جس کے نہ ہونے سے بہت سے ذکی الطبع اشخاص ناکام رہتے ہیں یعنے ماتحتوں کے عمدہ انتخاب کا ملکہ۔ وہ لوگوں سے واقف تھا اور ہر ملازم کو اس کے حسب حال خدمت کے لیئے منتخب کرتا تھا اور اسی وجہ سے ناقص و پُر آشوب زمانے میں بھی حیرت انگیز طریقے پر اس کی تمام خدمتیں انجام دی جاتی تھیں اس کے طبعی حرص وطمع کا بدل حسن خدمات کے اعتراف وصلہ دینے میں فیاضی سے ہوتا تھا اور جو کچھ لوٹ مار کر وہ لوگوں سے وصول کرتا تھا اسے نہایت فیاضی سے وہ پھر لوگوں کو بانٹ دیتا تھا۔ اس کے مقبول ومنظور اشخاص کو بڑی بڑی جاگیریں یا محاصل کی مقدار وافر دی جاتی تھی اور اس کی ضرورت زیادہ تر

اس وجہ سے تھی کہ اُن لوگوں کو اس آمدنی کا حصہ کثیر فوج کی آراستگی میں صرف کرنا پڑتا تھا تاکہ سردار کے طلب کرنے پر فوراً وہ ضرورت مہیا ہو سکے۔ رنجیت سنگھ کے پاس جو کچھ تھا وہ دوسروں سے چھینا جھپٹا ہوا تھا۔ فیاضی اور حرص میں قریبی رشتہ ہے جیسا کہ مانٹی کارلو یا قمار خانوں میں روزمرہ نظر آتا رہتا ہے۔

اگرچہ رنجیت سنگھ کے عیوب اور نقائص کا اخفا یا پردہ پوشی تاریخی سچائی کے منافی ہے تاہم خود اس کے یا ان معایب و نقائص کے متعلق اس وقت کی معاشرت پر غور کئے بغیر کوئی رائے قائم کرنا نادرست ہے۔ ہر زمانہ و ہر قوم میں نیکی کا ایک خاص معیار ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو بات آجکل معیوب و ناشائستہ تصور کی جاتی ہے وہ آگے چل کر سو سال بعد عام طور پر پسندیدہ خیال کی جانے لگے۔ تہذیب و شائستگی کے زمانے میں بھی عیوب کی حالت غیر مہذب زمانے سے کم نہیں ہوتی۔ تہذیب کی حالت میں صورت حال یہ ہوتی ہے کہ جب مکاری کی ضرورت پڑتی ہے تو بڑی عیاری سے ان عیبوں کی پردہ پوشی کی جاتی ہے اور اس طور پر نیکی بدی سے گویا ایک قسم کا خراج تحسین حاصل کرتی ہے شاہان جارج کے زمانے میں ہمارے آبا و اجداد بھی اسی طرح علانیہ اور کثرت سے شراب خواری کرتے تھے جس طرح لاہور کے دربار کے سردار۔ "امرا کی طرح مے نوشی" ضرب المثل ہو گیا تھا جس سے اٹھارھویں صدی کے انگریز امرا کی اخلاقی حالت و عادات کا پورا پورا اظہار ہوتا تھا۔ اب یہ رنگ بدل گیا اور لوگ بہت کم یا چھپ کر شراب پیتے ہیں۔ عورت و مرد کے تعلقات کے لحاظ سے پنجاب کی اخلاقی حالت حد درجہ پست تھی لیکن سکھ یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ان کے یہاں عورتوں کی حالت قدرتی طور پر بہت گری ہوئی تھی۔ اور مغربی ممالک کی طرح تعلیم اور دُوسرے اثروں سے اُن کی وقعت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوئی تھی اور ایسی حالت میں عورت یا مرد سے عفت و عصمت کے بارے میں اعلیٰ خیالات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن اگر ہم عصر تحریرات کافی شہادت متصور کی جا سکتی ہے تو پیرس کی آجکل کی تمدنی حالت بھی ویسی ہی خراب ہے جیسی ۱۸۳۰ء میں پنجاب کی تھی اور لاہور کے بازاروں میں جب رنجیت سنگھ ہولی کا تہوار منایا کرتا تھا پکاڈلی کے شب کے ان نظاروں سے زیادہ شرمناک نہ تھے جو ۱۸۹۲ء میں نظر آتے تھے۔

یہی حال رنجیت سنگھ کے سیاسی طریقوں کا ہے۔ سکھ سرداروں میں ظلم وستم مکروفریب گویا ان کی سرشت میں داخل تھے۔ یہ اوصاف ان لوگوں کے پشت و پناہ وقوت بازو تھے جو ایک بداخلاق اور اسی سوسائٹی میں جس کا اجتماعی شیرازہ بکھرا ہوا تھا ہر وقت حملوں کی مدافعت اور اپنی جان و مال کی حفاظت کرنے پر مجبور تھے۔ اگر شیر کو اس کے ناخن و دنداں کے استعمال پر ملامت کرنا مناسب سمجھا جا سکتا ہے تو مہاراجہ اور اس کے دربار کے سرداروں کی فوجی اور سیاسی تاریخ کے عنصر غالب مکروفریب کو اُن کے روزمرہ کی زندگی اور تعلقات کے لحاظ سے غیر معمولی وناواجبی قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج بھی افغانستان کا حاکم اپنے نظم ونسق کی بنا انھیں اصولوں پر قائم کرتا ہے جو رنجیت سنگھ کے تھے۔ تاہم سلطنت انگریزی جس کا وہ ماتحت اور فوج کی فراہمی کے لئے متعہد ہے اس بارے میں اعتراض نہیں کرتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وحشی اقوام کے ساتھ سخت گیری کی ضرورت ہے اور یہ کہ اگر اور جماعت پر عقل اور قوانین کے ذریعے سے حکومت کی جاسکتی ہے تو دوسری قوم میں امن وامان کے قائم رکھنے کیلئے صرف پھانسی اور جلاد ہی کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اطوار وخصائل کے بارے میں تصفیہ کرتے وقت ان امور پر خوب غور کرلینا چاہئے اور اس کو ان کا پورا فائدہ دینا چاہئے۔

اگر ہم اپنے دلوں سے تعصبات اور ظاہرداری کی نیکی کے خیال کو دور کرکے صرف اُن نادر اوصاف کو مدنظر رکھیں جن سے ایک شخص اپنے ہم عصروں میں ممتاز خیال کیا جاسکتا ہے تو ہم رنجیت سنگھ کو انسانوں پر حکمرانی کی حیثیت سے ایک ہیرو قرار دے سکتے ہیں اور اس مقام اعلیٰ پر جلوس کا مستحق قرار دے سکتے ہیں جو تاریخ نے ان مخصوص افراد کی عزت افزائی کے لئے معین کی ہے جن کی عظمت کے متعلق کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ اگر ہم جذبے اور تعصب سے اپنے دل کو صاف کریں اور رسمی نیکیوں سے قطع نظر کرکے صرف اُن شاذ و نادر خوبیوں پر نظر رکھیں جو ایک فرد انسان کو بنی نوع پر فوقیت دیتی ہیں۔ اُس صورت میں ہم فوراً قائل ہوں گے کہ باوصف اس کے کہ وہ اپنے عہد کی عام اور بدنما برائیوں سے کماحقہ بہرہ یاب اور نقص تعلیم وتربیت سے متاثر تھا۔ اُس نے ایسے مُلک پر حکومت کی جس کو اس کی فوجی ذہانت

اورعزم بالجزم نے فتح کیا اور اس قابلیت کی وجہ سے اس صدی کے مدبرین کی پہلی صف میں بٹھائے جانے کے قابل ہے۔

مہاراجہ کی خصلت کی بنا خود غرضی پر تھی۔ اُس کے تمام ملازمین میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ مہاراجہ اس کا شکر گزار اور گرویدہ تھا۔ اگر اس کلیہ کا کوئی استثناء تھا وہ جمعدار خوشحال سنگھ تھا جس کی قابلیت ادنے درجے کی اور عادتیں بہت مذموم تھیں۔ بایں ہمہ اس کے ملازمین اس کی خدمات کو اسس وفاداری سے بجالاتے تھے جس کا وہ کسی طرح مستحق نہ تھا۔ کپورتھلہ کے سردار فتح سنگھ کے ساتھ اس نے نمائشی محبت کے اظہار کے لئے بھائی چارے کے طور پر پگڑی بدلی۔ یہ وہ شخص تھا جو ۲۰ سال تک مہمات میں اس کا رفیق و شریک رہا تھا لیکن باوجود اسکے بھی اس کو اس کے مقبوضات سے بیدخل کرنے کی کوشش کی گئی۔ سردار ہری سنگھ نلوا جو اس کے سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ جری اور تہور شعار تھا جب افغانوں کی جنگ میں اُس کی خدمت کی انجام دہی میں مارا گیا مہاراجہ نے فوراً اس کی بڑی جائداد پر قبضہ کرلیا اور اُس کے چاروں بیٹوں کو نسبتہً مفلوک الحال کر دیا۔ وہ موروثی دولت وعزت کو ناپسند کرتا تھا اور تارکوئنیس سپرپس قیصر کی طرح سرافرازوں کی گردنیں ہمیشہ کاٹ دیا کرتا تھا۔ اوائل صدی میں سردار فتح سنگھ کلیان والہ تمام سکھ سرداروں میں سے ایک بڑا اور قوی سردار تھا ایک موقعے پر وزیر آباد کے مقام پر رنجیت سنگھ نے اس سے کہا کہ اپنی فوج کو ایک طرف جمع کرو تاکہ وہ اس کی تعداد کا اندازہ کر سکے۔ مہاراجہ کو سخت ناگوار ہوا کہ موجودہ فوج میں سے تعداد کثیر فتح سنگھ کے جھنڈے کے نیچے ہے۔ یہ امر اُس کی آتش رشک کے بھڑکانے کو کافی تھا۔ ۱۸۰۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار فتح سنگھ کے ہمراہی فوج کی کمان بذات خود اپنے ہاتھ میں لی اور نرائن گڑھ کا محاصرہ کیا۔ پندرہ روز تک بے سود محاصرہ کرنے کے بعد مہاراجہ نے سردار کو سرزنش کی کہ اُس نے اس مہم میں اتنی سرگرمی نہیں دکھائی جتنی کہ چاہئے تھی۔ اور کہا کہ میرا ساتھ ساتھ رہنا بہتر تھا تاکہ فوج کی کمان قرار واقعی ہو۔ فتح سنگھ نے اس ناواجبی سرزنش سے غصے میں آکر فوراً قلعے کی فصیل پر جس میں ایک شگاف پڑ گیا تھا حملہ کر دیا۔ مگر یہ شگاف ناکارہ ثابت ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کو پسپا ہونا پڑا اور اسی حملے میں مارا گیا۔ مہاراجہ کو اس طور پر

اپنے رقیب سے چھٹکارا نصیب ہوا اور اس نے اس کی تمام املاک فوراً کسی دوسرے سردار کو دے دی۔

سکھ ریاستوں میں سے ایک رام گڑھیا مسل بہت طاقتور تھی۔ جب رنجیت نے اس کے قلع قمع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تو اس کے پیشوا سردار جودھ سنگھ کے ساتھ بناوٹ سے محبت اور دوستی کا اظہار شروع کیا۔ اس نے اور رام گڑھیا خاندان کے مابین رفاقت دوستی کا عہد و پیمان امرتسر کے مندر میں سکھوں کی مذہبی کتاب کے روبرو کیا اور اس عہد نامے پر شاہی ناخواندہ طریقے سے بجائے مہر اپنی ہتیلی زعفران کے رنگ میں ڈبو کے چھاپا لگایا۔ کچھ عرصے تک اس معاہدے کی پابندی کی گئی کیونکہ جودھ سنگھ اس کا رفیق تھا اور اس کی فوج اکثر مہمات میں کارآمد ثابت ہوئی تھی۔ لیکن ۱۸۱۶ء میں جب اس سردار کا انتقال ہو گیا تو مہاراجہ کو اپنا کام کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔ ورثاء کو مداؤں میں وراثت کے تصفیے کے بہانے سے طلب کر کے اُن کے ڈیرے کا محاصرہ کیا اور سب کو قید کر لیا۔ پھر ایک زبردست فوج امرتسر روانہ کی اور رام گڑھیا کی تمام جاگیروں پر قبضہ کر لیا۔

ایک دوسرے جودھ سنگھ کے ساتھ بھی جو ایک مشہور بہادر اور جنگجو شخص اور وزیرآباد کا سردار تھا اس نے اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ مہاراجہ نے یہ سمجھ کر کہ وہ اس قدر طاقتور ہے کہ اس پر حملہ کرنا مشکل ہے اسے دوستانہ ملاقات کے لئے لاہور میں مدعو کیا جودھ سنگھ رنجیت سنگھ کے منصوبے کو تاڑ گیا اور اس لئے وہ فوج کی ایک کثیر تعداد اپنے ہمراہ لیتا آیا۔ رنجیت سنگھ نے اس سے درخواست کی کہ وہ فوج کو واپس بھیج دے۔ اور اس نے بھی غرور و نخوت کی وجہ سے اس فرمائش کی تعمیل کی۔ دوسرے دن وہ صرف بیس ہمراہیوں کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا اور اپنے ساتھیوں کو باہر چھوڑ کر خود اندر داخل ہوا۔ مہاراجہ نے بڑے تپاک سے اس کی آؤبھگت کی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دفعتاً کھڑے ہو کر اپنے آدمیوں کو اس کے گرفتار کرنے کا اشارہ کیا۔ جودھ سنگھ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں کیونکہ وہ کبھی زندہ گرفتار نہ ہوگا اور اس نے کبھی دشمن کے مقابلے میں پیٹھ نہیں دکھلائی۔ اس کی اس جرأت و دلیری کا مہاراجہ کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے

بہ عزت واحترام اس کو بیش بہا تحفے تحائف دیکر رخصت کیا اور اس کی ریاست میں اور اضافہ کردیا۔ یہاں تک تو رنجیت سنگھ اور جودھ سنگ دونوں کا طرزِ عمل قابلِ تحسین رہا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جودھ سنگھ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کے فوت ہو گیا تو مہاراجہ نے اس کی تمام املاک پر قبضہ کرلیا اور اگرچہ اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ بڑے لڑکے کے سنِ بلوغ کو پہنچنے پر د ریر آباد اس کو داپس دیدیا جائیگا لیکن اس وعدے کا ایفا کبھی نہ ہوا اور غالباً اُس نے ایفا کرنے کی نیت سے وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔

کسی سردار کے لئے اپنے تمول کا اظہار خطرے سے خالی نہ تھا۔ جب بٹالہ کے نوجوان سردار نے اپنی بہن کی شادی سردار شیر سنگھ سے کی تو دونوں خاندانوں نے اس تقریب میں دو لاکھ روپے صرف کئے ایسے جشن نگلجل نولہ کے ضلع میں اس سے قبل کبھی دیکھنے میں نہ آے تھے۔ رنجیت سنگھ نے جب اس واقعے کو سنا اور لڑکی کی ماں کے اس ڈینگ مارنے کا حال اسے معلوم ہوا کہ اس کے پاس دو پرولے[۱] روپیے کے بھرے ہوے ہیں تو اس نے فوراً اسے طلب کرکے کہا کہ جو خاندان شادیوں پر اتنا روپیہ صرف کرسکتا ہے اسے یقیناً پچاس ہزار روپیہ مجھے دینا کچھ گراں نہ گزریگا۔

باوجود اس درجے حریص اور طماع ہونے کے رنجیت سنگھ ظالم یا خونخوار نہ تھا۔ جب کسی قلعے پر قبضہ کرلیتا تو مفتوحین کے ساتھ لطف و ملائمت سے پیش آتا خواہ انھوں نے کتنی ہی شدت سے اس کا مقابلہ نہ کیا ہو۔ اس کے دربار میں بہت سے سردار ایسے تھے جن کی ریاستیں اس نے چھین لی تھیں لیکن ان کو ان کی حسب حیثیت خدمت سپرد تھی اور یہ لوگ اپنی قسمت پر شاکر تھے یہی نتیجہ مشرقی جبریت کا ہے جس سے مغلوبیت کا صدمہ مٹ جاتا ہے۔ یہ سردار مختلف ریاستوں کے پیشوا و فرمانروا تھے جنھیں اسنے تباہ کردیا تھا۔ وہ مساوات کے درجے سے گھٹا کر اس طرح بہ عزت واحترام ماتحت بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ مسلمان خان و دوسرے شرفا تھے جنھیں گوبند سنگھ سے نجات ملنا دشوار تھی جن کو گوبند ایک مختصر توبہ کی مہلت کے سوا کچھ نہ دیتا لیکن رنجیت سنگھ نے دانشمندی سے انھیں اپنا وابستہ دولت کرلیا تھا اور اس طور پر

---

[۱] پنجاب میں اناج رکھنے کے بڑے بڑے ٹوکروں اور مٹی کی ناندوں کو پرولا کہتے ہیں۔

مغربی اضلاع میں اس کا اثر بہت کچھ بڑھ گیا تھا۔ مسلمانوں کے قبائل سیالی۔ گھیا۔ ٹوانہ۔ کھرل اور ملتان کے نواب مظفر خاں کا خاندان ان لوگوں میں شامل تھے۔

رنجیت سنگھ نے جس طرح سے دنیا کا مشہور ہیرا کوہ نور حاصل کیا اور لیلیٰ نامی گھوڑی جو پیشاور کے افغان صوبہ دار کی ملک تھی اور جو اس زمانے میں کوہ نور سے کم اس کی شہرت نہ تھی جس طور پر اس کے قبضے میں آئی اس سے اس کی بدنیتی و وحشت کا کافی ثبوت ملتا ہے اور بجائے اس کے ان واقعات کا ذکر خالص تاریخی باب میں کیا جائے اسی باب میں اس کا تذکرہ زیادہ مناسب ہے۔

کوہ نور اس درجہ مشہور ہے کہ اس کے مزید حالات لکھنے کی ضرورت نہیں پائی جاتی۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے وہمی اور خیالی بزرگ پانڈوں کے قبضے میں تھا۔ اس کے بعد سے سولھویں صدی تک اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مگر اس وقت وہ پھر صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوا اور شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے تخت و تاج کی زیب و زینت بنا۔ اس کے بعد مشہور قزاق بادشاہ نادر شاہ نے دہلی کے لوٹ میں اس پر قبضہ کیا۔ اس کے قتل ہونے کے بعد یہ بیش بہا جوہر احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ آیا۔ اور ۱۸۱۳ء میں جب رنجیت سنگھ کو اس کے حصول کا موقع ہاتھ لگا تو وہ شاہ شجاع معزول امیر کابل کے قبضے میں تھا جس کو اس کے بھائی نے ملک بدر کر دیا تھا اور وہ پنجاب میں جلاوطن ہو کر آیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے کچھ تو سیاسی مصالح کے لحاظ سے یہ سمجھ کے کہ ممکن ہے اسے کوئی ایسا موقع ہاتھ لگ جائے کہ جس سے وہ افغان غاصب کے خلاف اسی سے کام لے سکے اور زیادہ تر اس غرض سے کہ مشہور ہیرا اس کے قبضے میں آجائے شاہ شجاع کو لاہور میں پناہ دی۔ سکھ مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ شاہ شجاع کی بیوی شاہ بیگم نے رنجیت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کے خاوند کی حفاظت کرے اور اس کے جانی دشمن پیشاور کے صوبہ دار فتح خاں کو اس کے حوالے نہ کرے تو وہ اسے کوہ نور ہیرا دے گی۔ اور رنجیت سنگھ نے فوراً اس تحفے کو قبول کیا اور اپنے معتمد فوجی افسر محکم چند کو روانہ کیا کہ معزول شدہ شاہ کو بہ عزت و احترام لاہور لے آئے۔

شاہ شجاع نے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ کوہ نور کا اس وقت تک کوئی ذکر نہ آیا جب تک کہ رنجیت سنگھ نے

اُسے لاہور میں بلا کر اُس حویلی میں نہ اتار لیا جو اس کے قیام کے لئے لاہور میں منتخب تجویز ہوئی تھی۔ لاہور آنے اور قیام کرنے کے بعد ہیرے کا مطالبہ نہایت درشتی کے ساتھ کیا گیا غریب شکست خوردہ بادشاہ نے ہیرے کے اپنے پاس موجود ہونے سے قطعی انکار کیا۔ رنجیت سنگھ نے دوبارہ پیغام بھیجا اور اس کے معاوضے میں بڑی جاگیر دینے کا وعدہ کیا۔ شاہ شجاع نے مکرر یہ کہلا بھیجا کہ وہ ایک صراف کے پاس امانت رکھوا دیا گیا ہے لیکن اس میں اور مہاراجہ میں دوستی کا تعہد اور کامل اطمینان ہو جائیگا تو اس وقت وہ اس کے حوالے کر دیا جائیگا۔ رنجیت سنگھ کو اس جواب سے سخت غصہ آیا اور مشرقی طریقۂ مہمان داری کو فراموش کر کے اس نے افغان کی جائے سکونت پر پہرا بٹھا دیا۔ اور ہر ایک شخص کی جو اس مکان سے باہر جائے تلاشی لینی شروع کی۔ کھانا بھی اس نے بند کر دیا جعلی خطوط پیش کئے گئے جن کے متعلق یہ بیان کیا گیا کہ وہ راستے میں روکے گئے ہیں اور انمیں شاہ شجاع نے اپنے افغانستان کے احباب کو دعوت دی تھی کہ وہ ہندوستان پر حملہ کریں اور اس کو قید سے رہائی دلوائیں ؛

شاہ شجاع کو گوبند گڑھ کے قلعے میں اسیر کرنے کی دھمکی دی گئی۔ آخر کار دو مہینے تک مدافعت کرنے کے بعد جب شاہ شجاع نے دیکھا کہ اسے لگاتار پریشان کیا جا رہا ہے اور اس کا خاندان وملازمین بھوک سے تنگ آ گئے ہیں اور اگر انکار جاری رہا تو اسے قید یا موت نصیب ہوگی تو اس نے ہیرا دینے کا اقرار اس شرط پر کیا کہ مہاراجہ قسم کھا کر اس کی حفاظت و دوستی کا وعدہ کرے اس کے لئے مہاراجہ ہر وقت تیار تھا۔ چنانچہ معاہدہ مرتب کیا گیا جن میں ادی گرنتھ اور دسویں گرو کے گرنتھ کی قسم کھا کر اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ شاہ شجاع کا دوست رہیگا اور اس کو کابل کا تخت دلانے کی پھر کوشش کریگا۔ اس کے بعد شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ کو بذات خود آ کر ہیرا لے جانے کے لئے مدعو کیا۔ مہاراجہ صرف چند ہمراہیوں کے ساتھ گیا۔ گھنٹے بھر تک سکوت کا عالم رہا اس کے بعد مہاراجہ نے اپنے نئے دوست وقیدی کو اپنے آنے کی وجہ سے مطلع کیا۔ شاہ شجاع نے ایک ملازم کو ہیرا لانے کا حکم دیا۔ ایک گٹھری سامنے لائی گئی اور جب وہ کھولی گئی اور مہاراجہ نے اس بات کا اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ وہ وہی ہیرا ہے جس کے حصول کی اسے اس درجہ تمنا تھی تو اس نے اسے نہایت بے تابی سے اٹھا لیا اور بغیر

رخصت ہوئے وہاں سے اٹھکر چلا گیا۔ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ عرصے کے بعد جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان نوواردوں کے پاس اب بھی نادرالوجود جواہرات ہیں تو اس نے بھائی رام سنگھ اور اپنی ایک بیوی کو بھیجا کہ تمام گھر یہاں تک کہ شاہ شجاع کے زنانے کی بھی تلاشی لے کر جس قدر جواہرات دستیاب ہوں ساتھ لے آئیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بیوی نے شاہ شجاع کی بیگمات اور اس کے خواصوں کی بھی جامہ تلاشی تک لی اور جو کچھ قیمتی سامان ملا وہ سب مہاراجہ کے پاس بھیجدیا گیا۔

۱۸۴۹ء تک کوہ نور لاہور میں رہا۔ پنجاب کے الحاق کے وقت بغرض اظہار اطاعت یہ ہیرا ملکہ معظمہ کے نذر کیا گیا۔ اور حق یہ ہے کہ اس جنگ میں جس کے لڑنے کے لئے انگریزوں کو سکھوں نے مجبور کیا تھا فتح یابی کے خیال سے قطع نظر کر کے بھی یہ ہیرا شاہان مغلیہ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے ملکہ وکٹوریہ کو ہی وراثتاً پہنچتا تھا۔

لیلیٰ نامی گھوڑی کے واقعات مختصراً بیان کئے جاسکتے ہیں۔ یہ گھوڑی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے افغانستان و پنجاب میں مشہور تھی۔ ۱۸۲۶ء میں رنجیت سنگھ نے اس کے مالک سردار یار محمد خاں صوبہ دار پیشاور کے پاس پیغام بھیجا کہ گھوڑی اس کے حوالے کردی جائے۔ سردار یار محمد خاں نے انکار کیا۔ فوراً سردار بدھ سنگھ سندھن والیہ کو جو بہترین سکھ فوجی افسر تھا گھوڑی کو چھین لانے کے لئے روانہ کیا گیا اور اسی کے ساتھ اس کو خلیفہ سید احمد پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا جو پیشاور کی پہاڑیوں میں سکھوں کے خلاف جہاد کا وعظ کر رہے تھے۔ سردار بدھ سنگھ نے دشمن کو شکست دی۔ مگر جانبین کا سخت نقصان ہوا اس کے بعد جب وہ پیشاور پہنچا تو معلوم ہوا کہ لیلیٰ مرگئی ہے۔ اس کے لاہور واپس آنے پر معلوم ہوا کہ یہ افواہ غلط تھی ایک دوسری فوج پھر شہزادہ کھڑک سنگھ کے برائے نام سرکردگی میں پیشاور روانہ کی گئی اور اسے حکم دیا گیا کہ یا تو گھوڑی دام دیکر خریدے یا زبردستی چھین لائے اور اگر یار محمد خاں اسے ہر طرح دینے سے انکار کرے تو اسے پیشاور کی صوبہ داری سے معزول کر دیا جائے۔ کھڑک سنگھ نے پیشاور کی طرف کوچ کیا۔ یار محمد نے جب یہ دیکھا کہ گھوڑی دینے سے اس کی آبرو پر حرف آئیگا تو وہ پہاڑیوں میں بھاگ گیا۔ کھڑک سنگھ پیشاور میں آٹھ مہینے تک قیام کرنے کے بعد واپس آگیا اور سردار سلطان محمد خاں کو وہاں صوبہ دار مقرر کر دیا۔ لیکن سکھوں کی فوج ابھی اٹک تک

بھی نہ پہنچی ہوگی کہ یار محمد خاں نے واپس آکر نئے صوبہ دار کو نکال باہر کیا۔ جنرل ونٹورا کو
جس کے زیر کمان اٹک میں سکھوں کی فوج تھی مہاراجہ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ گھوڑی کے
حاصل کرنے کے متعلق کارروائی کر کے اپنی قسمت آزمائی کرے اس کے لئے جس قدر
قیمت وہ مقرر کریگا وہ منظور کی جائے گی اور اگر اس طور پر دینے میں انکار کیا جائے تو پھر
لڑائی شروع کردی جائے۔ یار محمد خاں ابھی جواب دینے میں پس وپیش کر رہا تھا کہ خلیفہ
سید احمد نے پہاڑ سے اتر کر پیشاور کے شمالی دیہات میں لوٹ مار شروع کردی۔ صوبہ دار
خلیفہ کے نکالنے کی کوشش میں مارا گیا۔ لیکن مرنے سے پہلے اس نے لیلی کو حوالہ
نہ کیا تھا۔ جنرل ونٹورا خلیفہ سید احمد کو شکست دے کر پیشاور کے روبرو لشکر لئے
پڑا رہا اور سلطان فتح محمد خاں سے گھوڑی کا مطالبہ کرتا رہا۔ سلطان محمد خاں سے وعدہ
کیا گیا تھا کہ اگر وہ گھوڑی دیدے تو صوبہ داری پر اسے مستقل کردیا جائیگا سلطان محمد
بھی اپنے بھائی کی طرح لیت ولعل کرتا رہا اور اس وقت تک لیلی حوالہ نہ کی گئی جبتک
کہ ونٹورا نے خود اس کے محل میں اسے گرفتار کر کے اس وقت تک مقید رکھنے کی
دھمکی دی جب تک لیلی حوالے نہ کی جائے۔ استقلال سے بالآخر کامیابی نصیب
ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اور جنرل ونٹورا کو وہ گھوڑی ہاتھ لگ گئی جس کے حصول
کی بڑی تمنا تھی۔ گھوڑی لاہور پہنچائی گئی اور مہاراجہ نے اس کے ملنے کی بڑی خوشی کی۔ مگر
ابتک یہ امر مشکوک ہے کہ آیا اصل گھوڑی اس کو دی گئی یا نہیں۔ افغان
ایسی ذات ہیں کہ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھیں وہ دھوکا نہ دیں یا نہ دے سکتے
ہوں۔ ۱۸۳۱ء میں جب روپڑ میں مہاراجہ گورنر جنرل سے ملنے گیا تو ایک سبزہ گھوڑی
اسے دکھائی گئی جو لیلی بیان کی گئی۔ ہیوگل جب لاہور گیا تو اس نے خاص طور پر اس
مشہور گھوڑی کے دیکھنے کی استدعا کی جس کے متعلق مہاراجہ کا بیان تھا کہ اسے حاصل
کرنے کے لیئے اس کو ساٹھ لاکھ روپیہ خرچ اور بارہ ہزار آدمی کا نقصان برداشت
کرنا پڑا۔ اس نے لیلی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس پر مغرق جھول پڑی ہوئی
اور چاروں پیروں میں سونے کے کڑے تھے۔ وہ سبزہ رنگ تھی اور سیاہ دھبے
اس کے جسم پر تھے۔ عمر میں تیرہ سال اور ناپ میں پوری سولہ ہاتھ تھی۔ ونٹورا نے
ہیوگل کو یہ باور کرایا کہ اس گھوڑی کے لیئے پیشاور میں اس کو بہت کچھ مصیبتیں اٹھانا پڑی

تھیں۔ اس کے برخلاف سکھ مورخین کا بیان ہے کہ وہ گھوڑی تھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے اسی طرح اصلی لیلیٰ کی جنس بھی کہ وہ گھوڑی تھی یا گھوڑا تاریخی چیستان ہے۔ بہر حال طرابلسنہ کے مفتوح ہونیکے بعد سے آج تک کسی گھوڑی کی بدولت اس درجے پریشانی نہیں ہوئی اور اتنی بہادر جانیں تلف نہیں ہوئیں؛

مہاراجہ بے انتہا شرابی تھا اور اسی آتش سیال کے شوق اور اکثار نے آخر اس کی جان لی جس طرح بہت سے ہندوستانی والیان ملک کی جانیں گئیں جہاں عام رائے ایسی قوی نہیں ہوتی کہ والی ملک کو کثرت بے اعتدالی سے باز رکھ سکے؛

بعض اشخاص جو اپنے ہموطنوں (یعنی انگریزوں) کی تحقیر کے عادی ہیں اسی امر کے مدعی ہیں کہ مے نوشی کا عیب ہندوستان میں پردیسیوں کا پھیلایا ہوا ہے اور انگلستان کے ہندوستان کے فتح کرنے سے قبل ہندو پرہیزگار اور مے نوشی سے متنفر تھے۔ پنجاب یا سکھوں کی یہ حالت نہ تھی یہ لوگ ہمیشہ سے بدمست تھے۔ باب ماسبق کے زمانے کو دیکھو جبکہ سکھ انگریزوں کے نام تک سے بالکل آشنا نہ تھے ۱۸۱۳ء میں پٹیالے کا راجہ امر سنگھ کثرت مے نوشی سے فوت ہوا جیسا کہ اس سے قبل ۱۸۱۷ء میں اس کا باپ سردول سنگھ اور اس کا چھوٹا بھائی لال سنگھ اسی باعث سے ہلاک ہوئے تھے۔ بعینہ اسی طرح تقریباً ہر بڑے خاندان کے واقعات میں ایسی مثالیں ملینگی۔ تلوار و جسام دونوں مساوی طور پر خالصہ امرا کی تباہی کے باعث تھے؛

رنجیت سنگھ کی پسندیدہ شراب اناج کی تیز مقطر شراب تھی جس میں ماءاللحم۔ افیون۔ مشک اور بہت سی دوسری مختلف جڑی بوٹیوں کی آمیزش ہوتی تھی۔ اس قسم کی شراب وہ سر شام اور شب کو بکثرت پیتا تھا۔ اس کے اکثر درباری باستثنا فقیروں کے مسلمان خاندانوں کے اس کے خوش کرنے کو مے نوشی کے جلسوں میں شریک رہتے تھے اور اُس کے مثل ہمیشہ بدمست رہتے تھے۔ لیکن باوجود اس کثرت مے نوشی کے جو اس کے ملک و زمانے کے حسب حال تھی اور کوئی غیر معمولی امر تصور نہیں کی جاسکتی مہاراجہ اوقات معینہ پر کام کرنے کے لئے مستعد اور ہوش میں رہا کرتا تھا۔ غیر ملک کے لوگ جو اس کے دربار میں آتے اس کی ذہانت۔ تشخیص اور علم معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اسے دوسرے ممالک کے طریقوں اور نظم و نسق کے بارے میں گفتگو کرنے اور یورپ کی افواج و لڑائیوں کا حال سننے میں سب سے زیادہ لطف آتا تھا۔ اجنبیوں کے ساتھ اس کا برتاؤ خاص طور پر دل آویز و متواضع تھا۔ جو مسافر اس کے دور حکومت کے اواخر میں لاہور میں وارد ہوئے اُن کے بیانات

بہ کثرت مشہور ہیں اُن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقربین کو کس حد تک اپنا گرویدہ کرلیا کرتا تھا۔
اور اشخاص کی طرح جو تاریخ میں انتظامی قابلیت اور فوجی ذہانت کے لیئے معروف اور ممتاز ہیں رنجیت سنگھ بھی عورتوں سے متاثر ہوتا تھا لیکن اس کا تجربہ ایسا نہ تھا جس سے پنجاب کی خواتین کے اطوار و اخلاق کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم ہو سکتی۔ اس کی دادی مائی دیسن کو اس کے باپ نے ایک برہمن کے ساتھ سازش کرنے کے جرم میں مار ڈالا تھا۔ خود رنجیت سنگھ نے اپنی ماں رانی راج کور کو جو مائی مالوائی کے نام سے مشہور تھی اسی قسم کے الزام پر قتل کیا تھا۔ خود اُسکی بیویوں آشناؤں کے واقعات ایسے بدنام ہیں کہ یہاں برسبیل تذکرہ بھی ان کا اعادہ کرنا نامناسب ہے۔ جب اس نے اپنے فرزند کھڑک سنگھ کے بہ حیثیت وارث جائز جانشین مقرر کئے جانے کا انتظام کرلیا تو اس نے زنانے کی ناشائستہ سازشوں کی طرف توجہ کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ ان عورتوں نے اپنے بچوں کو کچھ تو سیاسی اغراض کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس طور پر اس کی نظر عنایت اپنی طرف مبذول کرائیں اس کی اولاد ہونا ظاہر کیا تھا۔ گو کہ اس زیرک مہاراجہ نے کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ لیکن اس نے ان بچوں کو کسی قدر تمسخر کے طور سے عموماً اپنی اولاد تسلیم کیا۔ اور وہ اکثر یہ پوچھا کرتا تھا کہ قسمت نے کیوں اس درجہ غیر معمولی فیاضی اس کے ساتھ کی ہے اپنے بیٹے کھڑک سنگھ اور پوتے نونہال سنگھ کے پاس اس نے اپنے زنانے کی اکثر ایسی مستورات کو بھیجا جن کے اطوار مشتبہ تھے۔ ان ہی میں ایک خوبصورت ایسر کور تھی جو کھڑک سنگھ کے مرنے پر ستی ہونے کے لیئے زبردستی مجبور کی گئی تھی:۔

رنجیت سنگھ نے اٹھارہ عورتوں سے شادی کی۔ اُن میں نو[9] کے ساتھ تو مذہبی مراسم ادا کیئے گئے تھے اور باقی نو[9] کے ساتھ معمولی چادر ڈالنے کی رسم ادا کی گئی تھی جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ ان میں سے صرف چند کے حالات قابل ذکر ہیں[۱]:۔

سب سے پہلی بیوی مہتاب کور تھی جس سے ۱۷۹۶ء میں بیاہ کیا گیا تھا۔ اسی شادی کی بدولت رنجیت سنگھ اس درجہ برسر اقتدار ہوا کیونکہ یہ ایک با اقتدار کنہیا امیر جے سنگھ کی پوتی اور اس کی وارث تھی۔ اس کی ماں بیوہ سدا کور نے جو درحقیقت ایک غیر معمولی عورت تھی اس امر کو سمجھ لیا تھا کہ اس کی لڑکی کا اثر قائم رہنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے خاوند کا وارث پیدا کرے اسی خیال سے اس نے مہاراجہ کی عدم موجودگی میں جب کہ وہ ایک مہم پر گیا ہوا تھا ایک لڑکے کو

[۱] رنجیت سنگھ کی تمام بیویوں اولاد جائز و ناجائز۔ اسکے فرزند پوتے اور جانشینوں کا پورا حال رئیسانِ پنجاب جلد میں تحریر کیا گیا ہے۔

تلاش کرکے اسے اپنی لڑکی کی اولاد مشہور کیا۔ اس لڑکے کا نام ایسر سنگھ رکھا گیا لیکن وہ صرف
ڈیڑھ سال تک زندہ رہا۔ اب سداکور نے توام کی کوشش کی ۱۸۰۷ء میں جب مہاراجہ ستلج اس پار کے
مہم پر گیا ہوا تھا تو اس نے مشہور کیا کہ مہتاب کور حاملہ ہے۔ اور جب مہاراجہ واپس آیا تو اس کے
سامنے مہتاب کے دو توام بچے پیش کیئے گئے ان میں ایک تو جلاہے کا بیٹا تھا اور دوسرا ایک سداکور
کی ایک خواص کا۔ رنجیت سنگھ نے اول اول تو اس اولاد کے بارے میں ہر قسم کے اقرار سے بالکل
انکار کیا لیکن دوسرے سال جب کہ وہ ستلج اس پار کے مقابلے میں انگریزوں سے تقریباً برسرپیکار تھا تو اس نے
یہ مناسب سمجھا کہ اپنی زبردست ساس کی دلجوئی کرے جس کی پشتی پر رام گڑھیا کے امرا تھے۔
اس نے ان توام لڑکوں کو اپنی اولاد تسلیم کرکے انھیں شاہزادوں کا مرتبہ دیا۔ ان میں سے ایک
تارا سنگھ فاتر العقل تھا۔ دوسرا شیر سنگھ بڑا بھلا خوش رو بہادر جوان تھا لیکن ساتھ ہی اول درجے کا بیوقوف
بھی تھا نونہال سنگھ کے بعد وہ تخت پر بیٹھا لیکن ۱۸۴۳ء میں سندھن والیہ سرداروں نے اسے قتل کردیا؛

مہاراجہ کی دوسری بیوی راج کور تھی جو نکائی سردار رام سنگھ کی بیٹی تھی۔ ۱۷۹۸ء میں
اس کا بیاہ مہاراجہ سے ہوا اور چار سال بعد اس کے بطن سے کھڑک سنگھ پیدا ہوا۔ یہی
صرف ایک جائز یا ناجائز اولاد تھی جو بیوی یا خواص کے بطن سے رنجیت سنگھ کے یہاں
تولد ہوئی۔ کھڑک سنگھ بلا کسی مزاحمت کے اپنے باپ کے مرنے پر گدی نشین ہوا۔
یہ بہت کم عقل شخص تھا اور اپنے جاہ طلب فرزند نونہال سنگھ اور جموں کے سازشی
راجاؤں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنا ہوا تھا جنھوں نے اس سے پوری طور پر کام نکالنے
کے بعد اسے زہر دیکر مار ڈالا۔ نونہال سنگھ اپنے باپ کے کریاکرم سے فارغ ہوکر واپس
ہی آرہا تھا کہ اس کا بھی کام تمام کردیا گیا؛

دوسری بیبیاں کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اُن میں سے ایک عورت جس سے
۱۸۳۲ء میں مہاراجہ نے مذہبی مراسم انجام دیکر بڑے دھوم دھام سے شادی کی
گل بیگم نام امرتسر کی کسبی تھی۔ مہاراجہ ابھی کم عمر ہی تھا کہ ۱۸۰۶ء میں ایک دوسری کسبی
موران نے اسے اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ اور رنجیت سنگھ بدمستی کے عالم میں ہولی کے تہوار
میں موران کو ہاتھی پر اپنے پہلو میں بٹھا کر گشت لگاتا اور اپنے اس فعل پر کسی طرح نہ شرماتا تھا۔ اس
عورت نے فیروزپور کی ملکیت کی سند حاصل کی اور اس کے مطیع کرنے کے لیئے فوج روانہ کی
لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اہل ہند عام طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو عورت سمجھے ہوئے تھے۔

اس کی تضحیک میں اس عورت کے نام و تصویر کا سکہ ڈھالا گیا؛

دوسری عورت جو مہاراجہ کے انتقال کے بعد مشہور بلکہ در اصل بدنام ہوئی وہ جنداں مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ماں تھی۔ وہ منا سنگھ نامی ایک لشکری کی بیٹی تھی اس کا باپ محل میں مامور تھا۔ یہ عورت رقص و نقالی کی وجہ سے مہاراجہ کی منظور نظر ہوگی جسے اسنے اپنے محل میں داخل کرلیا۔ یہاں اس نے علانیہ اس قسم کی بدفعلیاں کیں کہ لاہور کا دربار بھی باوجود اس درجے آزاد اور بد اخلاق ہونے کے تعجب کرتا تھا۔ ایک ادنی ملازم سقا گلو نامی عام طور پر دلیپ سنگھ کا باپ مانا جاتا تھا۔ بہرحال رنجیت سنگھ اس کا باپ نہ تھا کیونکہ وہ اس لڑکے کی پیدائش سے کئی سال پیشتر مفلوج ہوچکا تھا۔ علاوہ بریں اس نے جنداں سے باضابطہ یا بے ضابطہ کبھی بیاہ بھی نہیں کیا تھا بہتوں کا تو خیال یہ ہے کہ دلیپ سنگھ جنداں کے بطن سے پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ جموں کے راجاؤں گلاب سنگھ اور دھیان سنگھ کی کامیابی کے خیال سے وہ محل میں لایا گیا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ مہاراجہ کے تمام ورثا حقیقی یا غیر حقیقی کے برباد ہوجانے بعد کوئی ایسا لڑکا پیش کیا جاسکے جو اس کا جانشین بن جائے۔ اور یہ تو یقینی ہے کہ جنداں اور اس لڑکے کو ایک عرصے تک جموں میں پناہ دی گئی۔ اور عین وقت پر ان کو پیش کیا گیا۔ بہرحال جو کچھ ہوشیر سنگھ کے مرنے پر جو فتنہ مچا اس سے دیگ کا ابال اوپر آگیا تھا۔ جنداں نے مع اپنے آخری عاشق راجہ لال سنگھ کے اس فتنے میں نمایاں اور شرمناک حصہ لیا اور بالآخر اس کی اور اس کے اس نالائق عاشق کی بدمستیاں ہی تھیں جنھوں نے ستلج کی جنگ کرائی اور انجام کار سکھوں کی سلطنت کی بربادی کا باعث ہوئیں انگریز لڑائی کے بعد جب لاہور پہنچے تو دلیپ سنگھ جس کی عمر نو سال کی تھی برائے نام مہاراجہ تھا۔ چونکہ حالات موجودہ کو برقرار رکھنا مناسب تھا اور ملک کے لیئے کسی برائے نام حکمراں کی ضرورت تھی کیونکہ انگریزی سلطنت کو اس وقت تک پنجاب پر مستقل قبضہ رکھنا یا الحاق کرنا منظور نہ تھا اس لیئے خادمہ اور آب بردار کے لڑکے کو شیر پنجاب کے تخت پر متمکن کیا گیا۔ تقدیر جس کا چرخ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اس انقلاب پر یقیناً خندہ زن ہوگی؛

باب ششم

رنجیت سنگھ کا دربار

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی صرف مہمات کا خشک بیان۔ ریاستوں کے الحاق اور رئیسوں کو مغلوب کرنے کے واقعات انگریزی دانوں کو پڑھنے میں دلچسپ نہ معلوم ہوں گے۔ کیونکہ انھیں اس امر کے معلوم کرنے کی ضرور خواہش ہوگی کہ مہاراجہ کس طور و طریق کا شخص تھا۔ اس کی حیرت ناک کامیابی کے اسباب کیا تھے اور اس کے دربار کے سردار اور امرا کا کیا رنگ ڈھنگ تھا۔ اِس لیئے اس باب میں اس کے خاص خاص درباریوں کا مرقعہ کھینچنے کی کوشش کی جائیگی۔ ان میں سے بعض کے حالات ان کے جین جیمات یا ان اطلاعوں کی بنا پر اس سے قبل میں تحریر کر چکا ہوں جو ان کی اولاد و احباب سے دستیاب ہوئے ہیں۔[۵۱]

مہاراجہ نہایت زیرک تھا۔ وہ اپنے ماتحت عہدہ داروں کے حالات ماقبل دریافت کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا۔ جب تک کوئی شخص کاروبار سلطنت یا فوجی مہمات بعمدگی انجام دیتا اس وقت تک وہ اس کا معتمد بنا رہتا اور اسے اس کا صلہ دیا جاتا تھا۔ جوں ہی وہ دیکھتا کہ اس نے خیانت یا وہ شخص جسے اس نے کسی خاص کام کے لیئے انتخاب کیا جاتا اس کام کے ناقابل یا نامناسب ہے تو وہ حقارت کے ساتھ اُسے دُور کر دیتا اور اس سے اس درجہ بے تعلقی کرتا کہ ایسے مجرم کو سزا دینا اپنی کسر شان سمجھتا۔ ۱۸۱۸ء میں ملتان کی فتح کے بعد سلطنت مستحکم ہوگئی تھی اس کے بعد عام طور پر مہاراجہ کے عمل درآمد پر نظر کرنے سے حیرت ہوتی ہے کہ کیسے وفادارانہ طور پر اس کی خدمت انجام دی گئی اور اس کے ماتحت کس قدر کم اُس کے خلاف ہوئے۔ یہ سچ ہے بغاوت یا فریب سے کچھ فائدہ نہ تھا کیونکہ سلطنت کا ہر صیغہ خراب تھا عہدے دار جب تک شاہی خزانے میں مناسب مقدار محاصل داخل کرتے رہتے اس وقت تک

[۵۱] پنجاب چیفس

کاشتکاروں کے ساتھ جبر و تعدی کرنے کے متعلق کسی قسم کی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ جبر و تعدی کی روک صرف لوگوں کی مزاحمت سے ہوتی تھی جس کا پنجاب ایسے گرم مزاج میں سیاسی پیمانے کی حد معینہ پر واقع ہونا یقینی تھا۔ ضلع جہلم کے جاٹ سکھ و مسلمان سرکاری دست برد کو ایک معینہ و قدیم معمولی مقدار سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے۔ جب اس سے زیادہ دست درازی کی کوشش کی جاتی تو ان کے اور ان کے جرگوں کے ہاتھ فوراً تلوار کے قبضوں پر پڑ جاتے اور پھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا۔

سکھ سرداروں کو جاگیریں بھی دی جاتی تھیں تاکہ وہ اس کی آمدنی سے فوج آراستہ رکھیں اور بہ وقت ضرورت مہیا کر سکیں اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے تابعین کی ایک مسلح رنگ برنگی جماعت ساتھ رکھتے اور اپنے ضلع میں شاہانہ تزک و احتشام سے اپنی حیثیت قائم رکھتے تھے۔ اکثروں کو انتظامی اغراض کے لیئے ان کی جاگیروں کے علاوہ قطعات ملک تفویض کیئے جاتے تھے گو اس نظم و نسق کا مقصد صرف یہ تھا کہ موجودہ سرکاری تحصیل وصول کی جاے۔ ایسی صورتوں میں، عام کاروبار ساہوکاروں و گماشتوں کے حوالے ہوتا تھا جنھیں سکھ سردار اپنی ذمہ داریاں تفویض کر دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی دستوری بمقدار کثیر وصول کر لیتے تھے اور ان کے آقا کبھی دریافت بھی نہ کرتے تھے کہ کس قدر رقم وضع کی گئی۔ جو حالت اس وقت پنجاب کی تھی وہی حالت اب بھی ہندوستان کی بعض جاگیری ریاستوں کی ہے۔ مہاراجہ سندھیا آنجہانی نے بہت سی وسیع ریاستیں اپنے درباریوں کو دے رکھی تھیں ان لوگوں نے کبھی ان جاگیروں میں قدم تک نہیں رکھا اور صرف یہ انتظام تھا کہ گوالیار میں بالالتزام محاصل انھیں پہنچ جایا کرے۔ ان دور افتادہ جائدادوں پر ہر طرح کا جور و تعدی اور بدعنوانی پھیلی ہوئی تھی۔ تمام مالی اور عدالتی انتظام کسی لالچی برہمن یا بنیے کے ہاتھوں میں ہوتا تھا جس کی برائے نام تنخواہ ہوتی تھی اور جو آقا کے ساتھ تغلب تصرف اور رعایا سے دست درازی کر کے متمول بنا ہوا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ توہم پرست تھا لیکن دیندار نہ تھا۔ اسے زمانۂ شباب کی آوارگی اور جوانی میں جہات کی مصروفیت سے نہ تو اتنی فرصت ملی اور نہ اس کا میلان قلب اس جانب ہوا کہ گرو نانک کی لطیف دانشمندانہ تعلیم یا گرو گوبند کے پیچیدہ طریق زندگی کے احکام کو اخذ کر کے ان کی پابندی کرے۔ وہ ابن الوقت تھا موقع محل خوب دیکھتا تھا اسے

صرف وہ (مسئلہ) احکام پسند تھے جن سے وہ وحشی جاٹ رعایا پر اپنی حکومت کو اُستوار کردے۔ چنانچہ اس نے مناسب موقعوں پر بڑے بڑے عطیئے سکھوں کے مندروں و پوجاریوں کو دیئے اور بعض اہم پیشوایان مذہب بابا اور بھائیوں کی اس کے دربار میں اچھی آؤبھگت ہوئی۔ ان مذہبی بزرگوں کو جو زیادہ سے زیادہ سرسری طور سے تعلیم یافتہ تھے اور جو نانک کی صوفیانہ تعلیم سے اتنے ہی کم بہرہ ور تھے جیسے کہ آج کل کے سکھ پوجاری مذہب کی پابندی کا اسی وقت تک خیال رہتا تھا جب تک کہ عدم پابندی پر سکوت کرنے کے معاوضے میں انھیں معتد بہ رقم مل سکے۔ سکھ مذہب کا اصل اصول اسلام کو برباد کرنا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو سلام کرنا ان سے میل جول رکھنا یا کسی شرط سے ان سے مصالحت کرنا ناجائز تھا۔ لیکن مہاراجہ کے بہت سے معتمد وزرا اُسی مذہب کے تھے جو مذہب سکھوں کے نزدیک قابل نفرت تھا۔ گروگوبند سنگھ نے جسے ہندوؤں کے روحانی پیشواؤں یعنے برہمنوں نے ان کے اقتدار تسلیم نہ کرنے اور ذات پات کی قید اٹھا دینے کی وجہ سے مردود قرار دیا تھا ان برہمنوں کی ماموری صریحاً ممنوع قرار دی تھی۔ پھر بھی جمعدار خوشحال سنگھ۔ راجہ تیغ سنگھ۔ راجہ صاحب دیال۔ راجہ رلیا رام۔ دیوان اجودھیا پرشاد۔ پنڈت شنکر ناتھ اور بہت سے دوسرے ممتاز درباری برہمن تھے۔ مہاراجہ کی یہ بے تعصبی بے پروائی اور خود غرضی پر مبنی تھی روشن خیالی کو اس میں بہت کم دخل تھا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ مذہبی بے تعصبی کسی ملک یا زمانے میں کوئی مستحکم بنیاد رکھتی ہے۔ تعصب سخت اور جوش افزا عقائد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ مذہبی جنون اسی وقت جاتا ہے جب شک مذہب میں جگہ پا جاتا ہے اور مذہبی جوش کی آگ کے شعلے ذرا دب جاتے ہیں بہر حال اس کی اصلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو مہاراجہ کی آزاد خیالی کا اثر اس کی سلطنت کے نظم ونسق پر بہت اچھا پڑا اور دوسری سکھ ریاستوں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی۔ گروگوبند سنگھ کو جو تعصب منظور تھا اور جو مسلمانوں کے تعصب کی طرح خوفناک تھا آج کہیں پتہ نہیں چلتا ستلج اس پار کی بڑی ریاستوں میں سے پٹیالے میں تین حکمرانوں کے زمانے میں وزیر اعظم اور معتمد خارجیہ کے خدمات کو دو مسلمان شرفا خلیفہ سید محمد حسن اور خلیفہ سید محمد حسین نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ ان کی قابلیت ایمانداری اور کمال کے لحاظ سے کسی دیسی ریاست میں کوئی شخص ان پر فوقیت نہیں رکھتا۔ سکھوں کی ریاستہائے کپورتھلہ نابھ اور جیند میں اسی مذہب کے عہدہ دار

معزز و ذمے دار خدمات پر مامور رہیں۔ برہمنوں کے بارے میں گوبند سنگھ نے جو قاعدہ مقرر کیا تھا اس کے متعلق احتمال یہ ہے کہ ایک مذہبی رائے سے بڑھ کر اس کی کوئی وقعت نہیں کی گئی۔ کیونکہ ہندوؤں کی مذہبی حکومت نے ان لوگوں پر گہرا اثر ڈال رکھا تھا جو کبھی اسی زمرے میں شامل تھے اور وہ اس طوق غلامی سے اپنی گردنوں کو بھی رہا نہ کر سکتے تھے۔ سکھوں میں دلیر سے دلیر بھی علانیہ طور پر برہمنوں کی بزرگی کے خیال کو پامال کرنے کی جرات نہ رکھتا تھا۔ بہرحال سکھ مذہب کے احکام مذہبی کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ ناممکن تھا کہ انتظام سلطنت کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لئے مسلمانوں اور برہمنوں کو شریک نہ کیا جاتا کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جن میں انتظام سلطنت کا موروثی مادّہ موجود تھا۔

جمہوریت مساوات فہم کی خواہ کتنی ہی مدعی کیوں نہ ہو اور ذکی الطبع اشخاص کی کتنی ہی مدح سرائی کیوں نہ کرے لیکن یورپ و امریکہ کی جمہوریتوں کے طرز عمل نے اسی اصول کو غلط ثابت کر دیا۔ حکومت ایک فن ہے جسے بلاشبہ غیر معمولی ذہانت کے اشخاص کو بھی بغیر خاص تعلیم کے بھی کماحقہ مزاولت ہو سکتی ہے لیکن دوسرے کمالات کی طرح یہ بھی بڑی محنت و مشقت سے حاصل کی جاتی ہے اور موروثی مناسبت اور گروہ و خاندان کے حکمرانی قدامت اس کی کامیابی کے قوی اسباب ہوتے ہیں۔ اس طرح رنجیت سنگھ کے زمانے میں صرف برہمن و مسلمان ہی انتظام حکومت سے ایک قسم کی موروثی مناسبت رکھتے تھے۔ برہمن ہندوؤں کے موجودہ سیاسی نظام کے موجد ہیں اور گو انھوں نے جنگجو فرقوں کو بڑی دانشمندی سے بادشاہی شان اور اس کے ساتھ ہی خطرات بھی تفویض کر رکھے ہیں لیکن اصل اقتدار انھوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ بادشاہ کے روحانی پیشوا اور دنیاوی مشیر ہوتے ہیں۔ ان کے اقتدار کے روبرو بادشاہ کا اقتدار ماند پڑ جاتا ہے۔ وہ سلطنت کرتا ہے اور یہ حکومت۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ سیکڑوں سال تک ان کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور انھوں نے ملک کو فتح کر کے اس پر ایک فوجی سلطنت کی حیثیت سے حکمرانی کی۔ مگر اس پر بھی وہ ان ہندو راجاؤں کی طرح جو اُن کے پیشرو تھے برہمنوں سے پوری طور پر چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ تاہم مسلمان بادشاہوں کے ملازم زیادہ تر ان کے ہم مذہب تھے جو یا تو حملہ آور فوج کے ساتھ آئے تھے یا اس کے سرداروں و عہدہ داروں کی اولاد تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اچھے خدمات پر مامور

ہوگئے۔ یہ لوگ ہندوؤں کی جماعت میں نہایت ہوشیار تھے کیونکہ فاتح کا مذہب قبول کر لینا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر دانشمند اور زیرک تھے۔

ان ذہین و تعلیم یافتہ اقوام کا غریب جاٹ کاشتکار بھلا کیا مقابلہ کر سکتے تھے جن کی سمجھ ان کی بھینس کی سمجھ سے ہرگز زیادہ نہ ہوتی تھی۔ دربار کی فضا میں سیاسی فتوحات اور ذہانت آزمائی سے انھیں کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ وہ اچھی جنائی کرنے اور لڑنے کے سوا اور کسی کام کے نہ تھے۔ برہمن اور مسلمانوں کی ذہانت کے مقابلے میں ان کی حالت بعینہٖ ویسی ہی تھی جیسے اصیل گھوڑے کے مقابلے میں کرایہ کا ٹٹو۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس حقیقت کو اپنے ابتدائے زمانے میں محسوس کر لیا تھا۔ ۱۸۰۷ء میں سردار فتح سنگھ کلیان والہ نے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے بستر مرگ پر پڑے ہوئے اسبارے میں اور بھی زور دیا تھا۔ فتح سنگھ اس زخم کی وجہ سے ہلاک ہوا جو نارائن گڑھ کے محاصرے میں لگا تھا جہاں اسے ناکامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اس سردار نے یہ مشورہ دیا تھا کہ کبھی کسی جاٹ سکھ کو دربار میں کوئی بااقتدار خدمت نہ دی جائے اور فوجی خدمات کی حد میں رکھا جائے۔ یہ روایت خواہ صحیح ہو یا غلط یہ یقینی ہے کہ مہاراجہ نے اس اصول کو مدنظر رکھا اور اس پر عمل کیا۔ فوج میں بہادر سے بہادر عہدہ دار جاٹ تھے لیکن مجلس شوریٰ میں برہمن راجپوت اور مسلمان یا کھتریوں پر مشتمل دیوان ساون مل پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ جاٹ سکھوں کی خصوصیات میں اب بھی کوئی اصلاح نہیں ہوئی باوجودیکہ انگریزی حکومت میں ان کی دو پشتیں گزر گئیں لیکن ان کی جو حالت اس وقت تھی وہی اب بھی ہے اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی وہ اب بھی تعلیم سے گھبراتے۔ عقل کے ٹھوس اور اپنے عادات و خیالات میں ویسے ہی سادہ ہیں جیسے رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھے جس نے انھیں کچھ عرصے کے لیئے انھیں برائے نام ایک قوم بنا دیا تھا۔

اجنبی جو رنجیت سنگھ کے دربار میں جاتے تھے ان کو سب سے نمودار شخص فقیر عزیز الدین وزیر خارجیہ نظر آتا تھا۔ یہ شخص اور اس کے دونوں بھائی نور الدین و امام الدین بخارا کے ایک معزز خاندان کے تھے۔ اور اب تک اس ملک میں اس کی اولاد سکونت گزین ہے۔ اس کا باپ غلام محی الدین ایک ہوشیار طبیب تھا۔ ۱۷۹۹ء میں لاہور کے افسر الاطبا نے جس کے پاس عزیز الدین زیر تعلیم تھا اسے رنجیت سنگھ کی خدمتیوں میں مامور کرا دیا۔

اس وقت لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ہی رنجیت سنگھ کو آشوب چشم کی شکایت پیدا ہو گئی اس نوجوان حکیم نے جس ہوشیاری و توجہ سے اس کا علاج کیا اس سے رنجیت سنگھ کے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی۔ عزیز الدین کو بہت سے دیہات عطا کیئے گئے اور وہ مہاراجہ کا خاص حکیم مقرر کیا گیا۔ اور جس طرح رنجیت سنگھ کے ملک و دولت میں اضافہ ہوتا گیا اسی طرح عزیز الدین کی دولت اور جاگیروں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ یہ اسی شخص کا دانشمندانہ اثر تھا کہ رنجیت سنگھ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے سے باز رہا جب کہ انھوں نے سب سے اول اس کی قوت کو ستلج کے شمالی فتوحات تک محدود کردیا تھا۔ مہاراجہ عزیز الدین کے اس دانشمندانہ مشورہ کا اس درجہ قائل ہوا کہ اس کے بعد کبھی کوئی اہم کام بغیر اس کے مشورے کے نہیں کیا۔ یوروپین اور انگریزی حکومت کے متعلق ہر معاملے کا تصفیہ کرنے کے لئے عزیز الدین ہی کو مامور کیا جاتا تھا۔ اس شخص کی روشن خیالی اور آزادانہ مشورہ کی بدولت انگریزی حکومت کے اور مہاراجہ کے مابین رابطہ اتحاد آخر تک قائم رہا۔ فقیر عزیز الدین پر اس کو ایسا اعتماد تھا کہ مہاراجہ اکثر اپنی پوری فوج لیکر دور دراز مہمات پر چلا جاتا اور صرف چند آدمیوں کے ساتھ اسے لاہور کی حفاظت کے لئے چھوڑ جاتا۔ کبھی فقیر عزیز الدین فوجی خدمت پر بھی مامور کیا جاتا اور جب کبھی کسی خاص سفیر کے بھیجنے کی ضرورت ہوتی مثلاً ۱۸۳۱ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے پاس اور ۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خاں کے پاس فقیر عزیز الدین ہمیشہ انتخاب کیا جاتا اور وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرتا۔ ۱۸۳۱ء میں مہاراجہ کے گورنر جنرل سے روپڑ کے مقام پر ملاقات کے مشہور تاریخی موقعے پر جو پارچہ طلائی کے میدان کی ملاقات کے نام سے مشہور ہے اور اسی طرح کے دوسرے یادگار و عظیم الشان ملاقات کے موقعے پر جو ۱۸۳۸ء میں فیروزپور کے مقام پر لارڈ آکلینڈ سے کی گئی تھی تمام ذمے داریوں کی خدمات فقیر عزیز الدین ہی کے تفویض ہوتی تھیں۔ وہ بڑا قابل اور رنجیت سنگھ کے درباریوں میں یقیناً سب سے زیادہ ایماندار اور دیانتدار شخص تھا۔

عزیز الدین ایسا ملنسار اور آداب مجلس سے اس درجہ واقف تھا کہ بہت کم لوگ اس سے برسرپرخاش ہوتے گو اس میں شک نہیں کہ اس کی ترقی اور رسوخ کی وجہ سے لوگوں کو اس سے حسد ضرور تھا۔ باوجود مسلمان ہونے کے ہندو ریاست میں وزارت کی

خدمات انجام دیکر اس طرح ہر دلعزیز رہنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ عقائد میں بالکل آزاد تھا۔ وہ صوفی منش تھا۔ اس فرقے کو اگرچہ کٹر مسلمان بے دین تصور کرتے ہیں لیکن مشرق کے اعلیٰ درجے کے شعرا اور خوشخیال لوگ اسی گروہ کے تھے وہ زاہد خشک نہ تھا بلکہ وہ تمام مذاہب کو یکساں قابل تنظیم اور نا قابل توجہ تصور کرتا تھا۔ ایک مرتبہ رنجیت سنگھ نے اس سے دریافت کیا کہ وہ ہندو مذہب کو زیادہ پسند کرتا ہے یا اسلام کو اس نے جواب دیا کہ "میری حالت اس شخص کی سی ہے جو کسی بڑے دریا میں شناوری کر رہا ہو اور جب ادھر اودھر نظر دوڑائے تو اسے دونوں کنارے بالکل یکساں نظر آئیں" وہ اپنے زمانے میں فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا اور جیسی اس کی تقریر تھی ویسی ہی تحریر۔ اس کے مرتبہ تحریرات سلطنت ایشیائی مذاق کے لحاظ سے ذوق سلیم و خوش تحریری کا نمونہ مانی جاتی ہیں۔ وہ خود مشرقی علوم کے تمام شعبوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور علم کا بڑا فیاض حامی اور خدا شناس تھا لاہور میں اس نے اپنے صرفے سے ایک دار العلوم عربی و فارسی تعلیم کے لئے جاری کیا اور پنجاب کے سابق علماء عربی کی ایک کثیر تعداد اسی درس گاہ سے مستفید ہوئی تھی۔

شاعر کی حیثیت سے عزیز الدین کا پایہ بہت بلند ہے اس کی فارسی نظم جس کا رنگ صوفیانہ ہے اپنی سادگی اور بلند خیالی کے لحاظ سے بہت دل آویز ہے۔ چند قطعات کا ترجمہ صوفی رنگ سے واقف کرنے کی غرض سے درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"اگر تم دنیا پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ وہ سایہ کی طرح گریزاں ہے۔

بیجا خواہشات سے کیوں اپنی طبیعت مکدر کرتے ہو دراں حالیکہ تمھیں ان کے انجام دہی کی قدرت نہیں۔

خود کو فراموش کر کے سر انجام خدا پر چھوڑ دو اور صبر کے ساتھ اس پر بھروسہ رکھو۔ تاکہ وہ تم کو اپنی نعمتوں سے مالامال کر دے اس کی رحمت کے منتظر رہو اور جو کچھ اس نے دیا ہے اس پر شکر کرو۔

دنیا کے مکروہات و مصائب سے کان بند کر لو۔ خدا ہی سے دل شاد کرو اور اسی کے رحم کا آسرا رکھو عقلا مجھ کو بت پرست تصور کرینگے اگر میں خودی کا بے سوچے سمجھے مدعی ہوں۔ دانشمند اور صاحب ادراک کے نزدیک اپنی ہستی کا ادعا حماقت ہے۔

گو سہراب زال رستم کو بھی تو نیچا دکھا دیا لیکن آخر کار تیری توانائی نا استوار

ونقش برآب ہے یہ وسواس ہی وسواس ہے کہ تخیل مکڑی کا سا جالا تنے یہ کافی ہے کہ میں آزادی کی ہوا کھاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہر چیز کا انحصار خدا ہی پر ہے ''

عزیز الدین کے شریفانہ برتاؤ اور چاپلوسی وتحسین میں مبالغہ کرنے کا پردیسیوں پر بہت گہرا اثر پڑتا تھا اور لاہور کے نامہذب و وحشیانہ انداز کے خیال سے اس کی یہ کیفیت اور بھی تعجب خیز تھی بخارا اور دہلی کے مسلمان درباریوں کی اصلی شان کا اس ان پڑھ سکھ سردار کے وزیر میں پائے جانے سے تعجب ہوتا تھا۔ بیرن چارلس ہیوگل نے ۳۶-۱۸۳۵ء میں پنجاب میں سفر کیا تھا اور پنجاب کے الحاق سے قبل جس قدر سفرنامے اس ملک کے متعلق لکھے گئے تھے ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اس شخص کا سفرنامہ ہے۔ اس شخص کے دل پر عزیز الدین نے گہرا اثر کیا تھا۔ اس کی رنگین بیانی کی اس نے بہت سی مثالیں تحریر کی ہیں۔ فقیر عزیز الدین حسب معمول مہاراجہ اور اس کے یوروپین مہمان کے مابین متوسط ہوتا تھا۔ بیرن ہیوگل کو بہت کچھ ترغیب دلائی گئی کہ وہ چھ ہزار کی بیش قرار ماہوار پر مہاراجہ کی سلک ملازمت میں داخل ہو۔ کیونکہ اس نوجوان سیاح کی قابلیت وکمال نے مہاراجہ کو متحیر کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مبالغہ تحسین جو فارسی زبان کی مروجہ آداب کلام کی چاشنی سے مملو تھا بیرن ہیوگل کے دل میں اس وزیر کی سچی عظمت تھی ''

۱۸۴۲ء میں عزیز الدین کو لارڈ ایلن برا کے ملاقات کے لئے فیروزپور روانہ کیا گیا جہاں بہت بڑا دربار منعقد ہونے والا تھا گورنر جنرل کے استقبال کے متعلق سکھ وفد کے حاضر نہ ہونے کی وجہ سے جس سوءادبی کا خیال کیا گیا تھا اس کا سبب اس نے ایسی قابلیت اور خوش اخلاقی سے پیش کیا کہ گورنر جنرل نے اسے بھرے دربار میں ہردو سلطنتوں کی دوستی کے محافظ کے لقب سے موسوم کیا اور اپنی جیبی طلائی گھڑی تحفے میں دی۔ میں نے یہ گھڑی اس کے فرزند سید جمال الدین میر منشی کے پاس اکثر دیکھی ہے جو لاہور میں میرا معتمد تھا۔ فقیر عزیز الدین کا دسمبر ۱۸۴۵ء میں عین اس شکست فاش سے قبل جو سکھوں کو پہلی لڑائی میں نصیب ہوئی انتقال ہوا۔ وہ مرتے دم تک سکھ فوج کے ستلج پر بغرض جنگ بھیجے جانے کے مخالف رہا اور اس طور پر گویا اس نے انگریزوں اور لاہور کے دربار کی آخری خدمت گزاری کی گو وہ بے سود رہی۔ اس کے خاندان کے اکثر اراکین سے میری ملاقات ہے لیکن ان سب میں اس کا بھتیجا شمس الدین

اس سے بہت مشابہ ہے۔ اب تو اس کا انتقال ہو چکا ہے لیکن عرصے تک ہم بے تکلف دوست رہے اور میں نے ہندوستان میں کوئی شخص اس سے زیادہ مہذب و سلیقہ شعار اور فارسی زبان کی رنگین بیانی میں اس سے بڑھ کر نہ دیکھا۔ عزیز الدین کے دونوں چھوٹے بھائی امام الدین و نورالدین مہاراجہ کے معزز اراکین تھے گو ان کی وقعت اپنے بڑے بھائی کے مثل نہ تھی خصوصاً نورالدین کی ملک میں عموماً بڑی عزت کی جاتی تھی اور ۱۸۴۶ء کی لڑائی کے بعد جب کہ راجہ لال سنگھ بغاوت کے جرم میں معزول کیا گیا تو مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سن بلوغ کو پہنچنے تک جو مجلس انتظام مملکت کے لیئے مقرر کی گئی تھی اس کا ایک رکن نورالدین بھی مقرر کیا گیا تھا۔ بڑا بھائی عموماً دربار میں فقیر صاحب کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور یہ لقب اس وجہ سے انھیں دیا گیا تھا کہ یہ خاندان فقیری حیثیت قائم رکھنا باعث فخر سمجھتا تھا اور باوجود امارت فقر منش تھا اور فقر و فاقے میں دن کاٹتا تھا۔ کیونکہ یہ تینوں بھائی بہت دولتمند تھے۔ نورالدین کو دربار میں خلیفہ صاحب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا امام الدین رنجیت سنگھ کے عہد حکومت کے ایک بڑے خطہ میں اور مہاراجہ شیر سنگھ کے زمانے تک امرتسر کے قلعے گوبند گڑھ کا حاکم رہا۔

دربار میں ملتان کے دو مسلمان نواب سرفراز خاں اور اس کا چھوٹا بھائی ذوالفقار خاں بہت ممتاز تھے۔ یہ دونوں بھائی سردار مظفر خاں کے فرزند تھے جو رنجیت سنگھ کے شہر ملتان پر حملہ کر کے قلعے میں روزن کرنے پر اس کی مدافعت میں اپنے پانچ بیٹوں اور جرگہ والوں کے تعداد کثیر کے ساتھ شمشیر بکف جاں بحق تسلیم ہوا۔ مہاراجہ کی فتوحات میں سے کسی فتح کے حصول میں اسے اس درجے مزاحمت و مشکل نہیں پیش آئی جیسی ملتان کی فتح میں۔ جب اس کی حکومت ملتان کے صوبے پر مستحکم طور پر قائم ہوگئی تو اس نے اپنے مفتوح دشمن کی اولاد پر عالی حوصلگی سے نوازش کی۔ وہ انھیں لاہور اپنے ہمراہ لایا اور ان کے لیئے وظائف مقرر کیئے جن کو سرکار انگریزی نے بھی ان کے ورثاء پر برقرار رکھا۔

دوسرا مسلمان سردار جس پر فتح حاصل کی گئی اور رنجیت سنگھ کے لواحقین میں لاہور میں تھا خدا یار خاں نامی ٹوانا کا سردار تھا۔ یہ شخص اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ ۵۰ ٹوانہ سواروں کا سرگروہ بنا کر لاہور لایا گیا پنجاب بھر میں ٹوانوں سے زیادہ کوئی شہسوار خوبصورت جوان ملنا ناممکن ہے۔ ٹوانا ہمیشہ سے اپنی بہادری کے لیئے مشہور ہیں اور

انگریز عہدہ داروں کی ماتحتی میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

مہاراجہ کے دربار میں جمعدار خوشحال سنگھ بھی ممتاز شخص تھا۔ وہ ضلع میرٹھ کے ایک برہمن دوکاندار کا بیٹا تھا۔ (۱۷) سال کی عمر میں وہ بتلاش معاش لاہور آیا اور دھونکل سنگھ والا فوج میں جو اس وقت مرتب کی جا رہی تھی پانچ روپیہ ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد ہی مہاراجہ کے عرض بیگی سے اس کی دوستی ہو گئی اور وہ مہاراجہ کے محافظ دستۂ فوج میں مقرر کیا گیا یہاں اس کی ہوشیاری خوبصورتی اور سپاہیانہ انداز کی وجہ سے مہاراجہ کی توجہ اس پر ہو گئی۔ اس کے خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک رات کو رنجیت سنگھ بھیس بدل کر باہر گیا۔ جب وہ واپس ہوا تو خوشحال سنگھ نے جو پہرے پر تھا اسے محل میں داخل نہ ہونے دیا اور رات بھر حراست میں رکھا۔ اسکی اس ہوشیاری و مستعدی سے رنجیت سنگھ اس درجہ خوش ہوا کہ اس نے اسے اپنا خاص محافظ مقرر کیا۔ بہرحال جو کچھ ہو اس کا رنجیت سنگھ کے مقربین کے زمرے میں شمار اور روز بروز ترقی کرنا یقینی امر ہے۔ ۱۸۱۱ء میں وہ ڈیوڑھی والہ یا عرض بیگی مقرر کیا گیا اور اسے جمعدار کا خطاب دیا گیا۔ اس خدمت کی بڑی وقعت تھی۔ عرض بیگی تمام مراسم کی انجام دہی کی نگرانی جلوس کی ترتیب اور دربار کی محافظت کیا کرتا تھا۔ اگرچہ روزانہ دربار میں عام شہر کا ذی وقعت عہدہ دار بلا امتیاز شریک ہو سکتے تھے لیکن مہاراجہ کی خانگی ملاقات اسی کے توسط سے ہوتی تھی گو ملاقاتی چاہے کتنا ہی عالی رتبہ کیوں نہ ہو۔

لاہور آنے کے پانچ سال بعد اسے سکھ مذہب میں داخل کیا گیا۔ اس کے بعد سے اس کی جلد جلد قدر افزائی ہونے لگی اور وہ متمول ہو گیا کیونکہ جو اثر اس کا اپنے آقا پر تھا اس کی وجہ سے درباریوں سے اسے رشوت و تحائف بہ کثرت ملتے رہتے تھے۔ وہ متعدد فوجی خدمات پر مامور کیا گیا۔ ۱۸۳۲ء میں بماتحتی شہزادہ شیر سنگھ وہ کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا گیا جہاں اس کے مظالم نے گرانی کو قحط سے تبدیل کر دیا۔ اس میں کوئی خاص جوہر یا قابلیت نہ تھی اور گو ابتدا میں مہاراجہ اس کی خوش وضعی سے متاثر ہونا بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد کی تصویروں سے تو وہ خوبصورت سکھ سرداروں سے بدرجہا بھونڈا بدصورت معمولی گنوار معلوم ہوتا ہے۔ دربار میں عام طور پر وہ ہر دلعزیز نہ تھا عموماً اس کے اطوار سے ظلم کے آثار نمودار تھے۔ اس کا بھتیجا تیج سنگھ بھی جو اس کے ساتھ لاہور آیا تھا

مقربین میں شامل اور راجہ بنا دیا گیا تھا۔ جب سکھوں کی انگریزوں سے پہلی مرتبہ لڑائی ہوئی تو یہ سکھ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا لیکن اس پر دغابازی اور بزدلی کا الزام عائد کیا گیا۔ لیکن سکھ فوج کے طبایع اس قدر متلون اور خبطی اور جن حالات میں اسے فوج کی سپہ سالاری کرنی پڑی اُس میں اس درجے دشواریاں تھیں کہ جن لوگوں نے تیج سنگھ کے واقعات اور حالات کو غور سے دیکھا ہے وہ کمزوری و تلون مزاجی کے سوا اُس کو کسی اور جرم کا مجرم بمشکل قرار دے سکتے ہیں ؛؛

ہری سنگھ نلوا جنگجو سرداروں میں سب سے زیادہ نام آور تھا اور مہاراجہ کو اس سے بہت گرویدگی تھی۔ یہ شخص بھی رنجیت سنگھ کی طرح گجرانوالہ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ سب سے بہادر تھا اور مہاراجہ کے تمام سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ ہوشیار بھی تھا اور تمام دشوار مہمات میں وہی سپہ سالار بنایا جاتا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں ملتان کی فتح زیادہ تر اسی کی کارگذاری سے ہوئی۔ اس کے دوسرے سال اس نے ایک دستہ فوج لیکر کشمیر پر حملہ کیا جہاں بعد میں وہ صوبہ دار مامور کیا گیا۔ لیکن اس کی طبیعت انتظام مملکت سے مناسبت نہ رکھتی تھی اور اس وجہ سے لوگ اس سے اس درجہ بگڑ گئے کہ مہاراجہ کو مجبوراً اسے واپس طلب کر لینا پڑا۔ اس کے بعد وہ پنجاب کی سرحد پر ہزارہ کا اور بعد میں پیشاور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ پیشاور ہی میں وہ ۱۸۳۷ء میں افغانوں کی جنگ کے عین معرکے میں مارا گیا ؛؛

ہری سنگھ نلوا کے بعد لڑنے والوں میں سردار عطر سنگھ سندھن والیہ بہت نمودار تھا۔ یہ شخص اپنی طاقت اور جرائت کی وجہ سے خالصے کا سورما مانا جاتا تھا۔ وہ خاص پنجاب کے ایک ذی اقتدار خاندان کا رکن تھا جس سے خود مہاراجہ کا تعلق تھا۔ سندھن والیہ گروہ بڑا شورہ پشت تھا عطر سنگھ اس کے بھائی لہنا سنگھ اور اس کے بھتیجے اجیت سنگھ ان سازشوں میں شریک غالب تھے جو رنجیت سنگھ کی موت سے قبل و بعد وقوع پذیر ہوئیں۔ انھوں نے جموں کے تینوں راجاؤں کے اقتدار کی مخالفت کی اور تینوں جان سے مارے گئے ؛؛

راجہ گلاب سنگھ راجہ دھیان سنگھ اور راجہ سچیت سنگھ ادنیٰ ڈوگر راجپوت خاندان کے افراد تھے لیکن محض اپنی قابلیت اور قوت عملی کے زور سے بادشاہت کے

آخر زمانے میں عروج حاصل کیا۔ منجھلا بھائی راجہ دھیان سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی میں ان سب میں زیادہ ممتاز تھا۔ وہ جمعدار خوشحال سنگھ کے بعد ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور کیا گیا اور کچھ عرصے تک وہی درحقیقت مدارالمہامی کی خدمت انجام دیتا رہا کیونکہ رعایا اور مہاراجہ کے مابین وہی واسطہ تھا اور سوائے محکمہ خارجیہ اور خزانہ کے جو راجہ دینا ناتھ اور فقیر عزیزالدین سے متعلق تھے دوسرے تمام محکموں پر اسے اقتدار حاصل تھا۔ اس کے بھائی گلاب سنگھ سے عموماً فوجی خدمات متعلق تھیں۔ لیکن مہاراجہ کے انتقال اور اپنے بھائی دھیان سنگھ کے قتل کے بعد وہ کچھ عرصے تک لاہور کے دربار کا سب سے مقتدر شخص ہو گیا تھا۔ ستلج کی پہلی لڑائی کے موقع پر اس نے انگریزوں کی ایسی خدمتیں انجام دیں جن کے لحاظ سے گورنر جنرل نے اُسے صوبۂ کشمیر کا خود مختار حاکم مقرر کیا۔ پنجاب کی تاریخ میں غالباً کوئی شخص راجہ دھیان سنگھ اور راجہ گلاب سنگھ سے زیادہ قابل تنفر نہیں ہے۔ ان کی اعلیٰ ذہانت اور حقیقی بہادری نے اور بھی زیادہ ان کے وحشیانہ مظالم۔ دغابازی حرص وجاہ طلبی کے عیوب کو نمایاں کر دیا ہے۔ تیسرا بھائی سچیت سنگھ فوج میں سب سے زیادہ خوش رو اور دربار میں شان دار شخص تھا۔ اس میں اپنے بھائیوں کی سی قابلیت نہ تھی اور لاہور کے سیاسی امور میں اُس کی مستقل شرکت نہ تھی۔ راجہ دھیان سنگھ کا بھتیجا راجہ ہیرا سنگھ ایک ہونہار نوجوان تھا وہ اپنے باپ کی جگہ مدارالمہام مقرر کیا گیا۔ لیکن اسی کی طرح سکھوں کی پہلی لڑائی سے قبل جو شورش اور فساد برپا ہوا اس میں مارا گیا۔

مہاراجہ کی آخر زندگی میں جن لوگوں نے اقتدار میں ترقی کی ان سب میں راجہ دینا ناتھ سے بڑھ کر کوئی قابل ذکر نہیں۔ اسے پنجاب کا ٹیلرانڈ کہنا بالکل بجا و درست ہے۔ اس کی زندگی اور روشن یورپ کے اس زبردست مدبر سلطنت کے بہت مشابہ تھی۔ بڑے بڑے انقلاب اُس کے سامنے گذرے جس میں اس کے احباب و سرپرست تلف ہو گئے۔ خاندانوں کو عروج و زوال ہوا لیکن اس کا بال بیکا نہ ہوا۔ قتل و خونریزی میں اس کی جان کبھی معرض خطر میں نہ پڑی۔ املاک کی ضبطی اور عدالتی لوٹ مار تمام ریاست میں پھیل گئی تھی لیکن اس کی دولت و اقتدار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اس کی فراست اور دوراندیشی ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ جب دوسروں کی نظر میں سیاسی مطلع پاک و صاف

نظر آتا تو وہ آنے والے طوفان سے آگاہ ہو کر متنبہ ہو جاتا اور اس جماعت سے کنارہ کشی کر لیتا یا اس دوست کو ترک کر دیتا جو معرض زوال میں آنے والا ہوتا۔ ایماندار اشخاص اکثر انقلابات سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اس کی بیوفائی اس کی کامیابی کا ذریعہ ہوئی۔ وہ محب وطن ضرور تھا لیکن اس کی حب وطن حب ذات کی تابع تھی۔ وہ انگریزوں سے سخت متنفر تھا کیونکہ وہ اس کی ذات اور اس کے ملک دونوں سے زیادہ طاقتور تھے لیکن اس کے اغراض نے ان لوگوں کی خدمت گزاری پر اسے مجبور کیا جیسے سمسون پہلوان فلسطینوں کی خدمت پر مجبور تھا۔ وفاداری کے متعلق اس کا خاص خیال تھا۔ وہ اپنے دوست کا اس وقت تک شریک رہتا جب تک کہ خود اس کو کوئی گزند پہونچے۔ وہ اس سے صرف اپنے اقتدار و دولت کے زوال کے اندیشے کی وجہ سے قطع تعلق کرتا نہ کہ کسی ڈر سے کیونکہ وہ فطرۃً بہادر تھا اور اس میں اعلےٰ درجے کی اخلاقی جرأت تھی گو وہ بلا لحاظ نتایج حق بات کے بیان ہرگز آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اس کی مقامی معلومات وسیع تھیں اور اسی طرح اس میں کام کرنے کی بھی بڑی صلاحیت تھی لیکن اس کی یہ خواہش کہ تمام اقتدار اس کے ہاتھ میں رہے اجرائی کار میں مخل ہوتی تھی۔ وہ بڑا دنیا دار تھا آداب صحبت سے آگاہ اور مردم شناس۔ گو وہ عالم نہ تھا لیکن اچھا تعلیم یافتہ تھا۔ انگریزوں کے ساتھ گفتگو کرتے وقت وہ جرأت اور بظاہر بیباکی سے کلام کرتا تھا اور چونکہ ایک ایشیائی شخص کے لئے یہ اوصاف غیر معمولی تھے اس لئے خوشنما معلوم ہوتے تھے۔

۱۸۳۴ء میں راجہ دینا ناتھ وزیر خزانہ مقرر کیا گیا جس کے لئے وہ بہت ہی موزوں تھا۔ لیکن مہاراجہ کو ایک عرصے سے اس پر اعتماد تھا اور تمام اہم معاملات میں وہ اسی سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ اپنے آقا کے مرنے کے بعد اسے سرداروں میں اور فوج پر بڑا اقتدار حاصل رہا اور سرکار انگریزی کے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مجلس انتظام ریاست کا رکن مقرر کیا گیا جہاں وہ بہت لایق اور کارآمد ثابت ہوا۔ اگرچہ خزانے کے افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے آپ کو سرکاری رقوم سے متمول ہو جانے کا بہت کچھ موقع تھا اور گمان غالب یہ ہے کہ اس نے اس موقع سے فائدہ بھی ضرور اٹھایا۔ لیکن اوروں کے مقابلے میں اس نے زیادہ بے غرضی سے کام کیا اور انگریزی سفیر مقیم لاہور کی بہت مدد کی۔ اس کی حساب فہمی اور کاروبار کی

انجام دہی کی عادت کی وجہ سے دربار کے حساب سلجھ گئے جن کا اس کے بغیر سلجھانا ناممکن تھا۔ اور پنجاب کے الحاق کے بعد دینا ناتھ سے محاصل و جاگیرات کے متعلق اُس کی مدد بھی قابل قدر تھی جیسے اس کے قبل تھی سکھوں کے ۱۸۴۸ء میں بغاوت کرنے کے موقعے پر بعضوں کا خیال یہ ہوا کہ دینا ناتھ پوشیدہ طور پر دغاباز ہے اور خود اس نے یہ شورش برپا کرائی ہے اور یہ کہ اگر وہ دولتمند نہ ہوتا اور اس کے پاس مکانات و باغات کے علاوہ لاکھوں روپے نقد لاہور میں نہ ہوتے جن کی ضبطی بہت آسان تھی تو وہ بلا تردد باغیوں میں شامل ہو جاتا۔ لیکن یہ سب قصے شاید اس کے دشمنوں نے تصنیف کئے ہیں لیکن امر یقینی یہ ہے کہ جب اسے لاہور واپس طلب کیا گیا تو اس نے سرکار انگریزی کے حکام کے حسب خواہش بڑی سرگرمی اور ستعدی سے باغیوں کی جایدادیں ضبط کرنے اور ان کے منصوبوں کے تباہ کرنے میں بہت کچھ مدد دی۔

دربار کے ہمیشہ حاضر باش لیکن عموماً خاموش درباریوں کے ضمن میں سکھ پوجاریوں بھائی رام سنگھ بھائی گوبند سنگھ اور بھائی گرمکھ سنگھ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ منجملہ پہلے دو ایک مشہور سکھ پوجاری اور گرو کے پوتے تھے جو لاہور میں رہتا تھا اور اٹھارھویں صدی میں سالہائے دراز تک سکھ اس کی عام طور پر عظمت و وقعت کرتے تھے۔ یہ مہاراجہ کے ۱۸۰۰ء میں لاہور فتح کرنے کے دو سال بعد تقریباً سو برس کی عمر میں فوت ہوا۔ رنجیت سنگھ اس بزرگ کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کے پوتوں کو اس نے جاگیریں عطا کیں۔ ان میں سے رام سنگھ بہت با اثر شخص تھا اور جنگ کے معرکوں میں ہمیشہ اس کا خیمہ رنجیت سنگھ کے خیمہ کے پاس نصب کیا جاتا تھا۔ مہاراجہ ہمیشہ ایک قاصد کو انھیں عزت کے ساتھ دربار میں لانے کے لئے روانہ کیا کرتا تھا اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ بھائی گرمکھ سنگھ سنت سنگھ کا لڑکا تھا۔ جو امرتسر کے دربار صاحب کا متولی تھا وہ پوجاری بھی تھا اور سپاہی بھی اور اکثر فوجی خدمتیں بڑی قابلیت سے انجام دی تھیں۔ جب اس نے دنیاوی کاروبار کو ترک کرکے سکھوں کی مذہبی کتاب کا مطالعہ اور تشریح شروع کی تو اپنے بیٹے گرمکھ سنگھ کو دربار میں روانہ کر دیا یہ نوجوان بھی اپنے باپ کی طرح ہر دل عزیز ہو گیا گو اسے کبھی اپنے حریف اور دشمن بھائی رام سنگھ کا سا اقتدار نصیب نہیں ہوا۔

لاہور کے دوسرے ممتاز لوگوں میں مصر بیلا رام کروڑ گیری کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس کا لڑکا آخر میں راجہ صاحب دیال کے لقب سے مخاطب ہوا۔ اٹاری والا خاندان کے سردار چتر سنگھ۔ شیر سنگھ اور شام سنگھ تھے۔ ان میں سے پہلے دو ۱۸۴۸ء کی سکھ بغاوت کے خاص سرغنہ تھے۔ مجیٹھہ خاندان کے سرداروں میں سے دیسا سنگھ اور اس کا بیٹا لہنا سنگھ سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ لہنا سنگھ حسام الدولہ یعنی "تیغ ریاست کا" لقب دیا گیا یہ بڑا قابل شخص تھا۔ وہ کلوں کے کام کا ماہر بلکہ موجد تھا۔ اس نے سکھ توپخانہ کی بہت کچھ اصلاح کی اور اس کی بنائی ہوئی چند خوبصورت توپیں علی وال اور اور مقامات پر بھیجی گئیں۔ منجملہ اور اشیا کے اس نے ایک گھڑی ایسی بنائی جس سے گھنٹہ۔ تاریخ اور چاند کے شکلات ظاہر ہوتے تھے۔ وہ علم ہیئت اور ریاضی کا بہت شوق رکھتا تھا اور کئی زبانوں میں کامل دستگاہ تھی۔ حاکم ہو کے وہ بہت ہر دلعزیز تھا۔ وہ کبھی غربا پر سختی نہ کرتا تھا۔ اس کی تشخیص لگان ہمیشہ معتدل اور اس کے فیصلے منصفانہ ہوتے تھے۔ بہ حیثیت مدبر وہی ایک شخص تھا جسے لاہور کے دربار میں ایماندار کہا جا سکتا ہے جعل و رشوت کا بازار گرم تھا لیکن لہنا سنگھ کے ہاتھ کبھی اس لوث سے آلودہ نہ ہوئے۔ طماع۔ بدنیت اور سازشی لوگوں کے نرغے میں وہ گھرا ہوا تھا کبھی اس نے اپنی ایمانداری پر حرف نہ آنے دیا۔

اگر لہنا سنگھ کی سی وقعت اور انتظامی قابلیت کا کوئی شخص ۱۸۴۵ء میں پنجاب میں مقدم ہوتا تو ملک پر جو بلائیں نازل ہوئیں وہ نہ آتیں۔ لیکن وہ حقیقی محب وطن نہ تھا۔ وہ نہ سمجھا کہ مدبرین سلطنت بلکہ ہر ایماندار شخص کا مذہب یہ ہونا چاہیئے کہ خطرے کے وقت اپنے ملک کا ساتھ دے۔ مصائب میں اس کا شریک رہے اور اگر ضرورت ہو تو اس کے زوال کے ساتھ خود ہی مٹ جائے۔

باب ہفتم

مہاراجہ کی فوج و انتظام مملکت

مہاراجہ کی فوجی طباعی کا اظہار فوج کی سپہ سالاری میں نہیں ہوتا تھا کیونکہ اسبارے میں اس کے بہت سے عہدہ دار اور دوسرے سردار اس پر سبقت لے گئے تھے۔ اس کی اس قابلیت کا اظہار اس امر سے ہوتا تھا کہ اس نے کس قدر طاقت ور تربیت یافتہ اور سازو سامان سے آراستہ فوج بے قاعدہ۔ سرکش اور خودسر سکھوں کی بھرتی سے قائم کی۔ درآنحالیکہ یہ لوگ جب کبھی انھیں لوٹ مار کے زیادہ مواقعے دستیاب ہونے کی توقع ہوتی تو ایک سردار کا ساتھ چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ جا ملتے اور اپنی سہولت و میلان طبع کے موافق سرداروں میں تغیر و تبدل کیا کرتے تھے۔

جس وقت اس کا دادا چرت سنگھ اور اس کا باپ مہان سنگھ سکر چاکیا ریاست پر حکمراں تھے اس وقت سکھ جماعت میں طوایف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے خودسری کے زمانے میں جب کہ ہر شخص جو کچھ وہ چھین جھپٹ سکتا اس پر قابض ہو جاتا اور اس کے برقرار رکھنے کے لئے بر سر مدافعت ہوتا تھا نئے سردار و پیشوا کم و بیش اقتدار کے ساتھ پیدا ہوتے رہتے تھے لیکن ایسی پیشوائی سے لوگوں کے نگاہوں میں اس شخص کی کوئی حقیقی وقعت و عظمت نہ ہوتی تھی۔ سکھوں کی مذہبی حکومت زمانہ حال کے یورپ و امریکہ کی جمہوریت سے حقیقتہً کہیں زیادہ مساوات و اخوت پر مبنی تھی۔

سکھوں کی تنظیم و لڑائی کے طریقے کا ذکر اس کے پیشتر کے باب میں کیا گیا ہے۔ یہ لوگ بالخصوص سوار تھے نہ کہ پیادہ۔ پیادہ فوج سوار سے کم رتبہ سمجھی جاتی تھی اور جنگ کے موقعے پر یا تو قلعوں کی نگہداشت اور عورتوں کی حفاظت کے لئے پیادے پیچھے چھوڑ دیے جاتے تھے یا لڑنے والوں کے ہمراہ اس غرض سے رکھے جاتے تھے کہ جب موقعہ ملے تو اپنے لئے خواہ چرا کر یا خرید کر گھوڑا مہیا کریں اور اس طرح اپنا مرتبہ تبدیل کر کے ان میں شامل ہو جائیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ابتدائی زمانے میں اپنی خداداد دانشمندی سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ سکھوں کا طریقہ جنگ ان لوگوں کی طبیعت کے مناسب نہیں ہے اور جب تک اس میں اصلاح نہ کی جائے اس وقت تک ایسی باضابطہ فوج پر جیسی کہ انگریزی فوج ہے کوئی مستحکم فتح کی توقع نہیں ہو سکتی جس کی قواعد و فوجی تربیت کو اسنے بغور و فکر دریافت کیا تھا یا افغانوں کی فوج کے مقابلے میں جو احمد شاہ کے زمانے میں معقول طور پر تربیت یافتہ ہو گئی تھی۔ جو کھلے میدانوں میں خونخوار دشمن تھے اور پہاڑیوں میں تو ان پر فتح پانا قطعاً ناممکن تھا۔ اس نے جب انگریزی فوجی تنظیم کی خوبی سے جس کے مقابلے میں ہندوستان کی تمام جنگجو قومیں طاقت آزمائی کر کے پست ہو چکی تھیں اچھی طرح واقفیت حاصل کر لی اور اس راز سے آگاہ ہو گیا تو اس نے اس امر کا مصمم ارادہ کر لیا کہ اسی طرز پر فوج کی تربیت کرے اور اسی کے ساتھ ایسا ہی مستحکم ارادہ اس طاقت سے صلح رکھنے کا کیا جس کی وہ وقعت کرنے لگا تھا۔ ان ہی خیالات کی بنا پر مہاراجہ نے خالصہ فوج کی تنظیم کو ایک سرے سے بدل دیا۔ اب سوار فوج کی اس درجہ اہمیت باقی نہیں رہی اور پیادہ فوج زیادہ پسند کی جانے لگی اس تبدیلی میں فرانسیسی و اطالوی عہدہ داروں کے تقرر سے زیادہ سہولت ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے عہدہ دار مستعار ملنے میں مہاراجہ کو ناکامیابی ہوئی تو اس نے ان عہدہ داروں کو مامور کیا۔ ان پردیسی افسروں نے ان طریقوں کا فوج میں رواج دینا شروع کیا جو یورپ میں عام طور سے رائج تھے اور جہاں پیادہ فوج سوار فوج کے مقابلے میں عام طور پر زیادہ کار آمد تصور کی جاتی تھی۔ ان میں سے بعض اشخاص بہت قابل تھے اور لاہور کی فوج کی اصلاح کے بارے میں انھوں نے جو کچھ وعدے کئے تھے ان کے ایفاء کی ان میں پوری صلاحیت تھی۔ ان کے زیر تربیت پیادہ فوج نہایت مہیب، منتظم باقاعدہ و مستعد بن گئی گو اُن کی فوجی نقل و حرکت میں پھرتی نہ تھی۔ ان میں صبر و برداشت کا مادہ بہت تھا اور بسا اوقات فوج کی فوج کئی کئی روز تک ایک ایک دن میں ۳۰-۲۰ میل سفر کرتی تھی ؛

مہاراجہ کے زمانے میں فوجی بھرتی خود اختیاری تھی لیکن باوجود اس کے نئے لوگوں کی دستیابی دشوار نہ تھی کیونکہ عام طور پر اس خدمت کو لوگ پسند کرتے تھے۔ سوار فوج کی تربیت اس وقت بھی تقریباً ویسی ہی تھی جیسے کہ خالصے کے زمانے میں۔

جب کہ فوج کے دل بادل افغانوں کی فوج کے کناروں پر منڈلاتے رہتے اور باضابطہ
فوج پر حملہ کرنے سے خائف ہو کر صرف بدرقہ پر حملہ کر کے دشمن کی خبر رسانی کے سلسلے کو
معرض خطر میں ڈالدیتے۔ اس میں شک نہیں کہ ہلکے مسلح سواروں کے اصلی فرائض میں
یہ بات داخل تھی لیکن سکھوں کی سوار فوج کے گھوڑے عموماً ناقص اور اسلحہ ناکافی
ہوتے تھے اور عام طور پر جب ان پر حملہ ہوتا تو بجائے اظہار مردانگی وہ بھاگنے میں زیادہ
مشہور تھے۔ پیادگی کی حالت میں سکھ سپاہی نہایت جری و مستعد ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ
انگریزی فوج میں بعض نادر دستے سکھ سواروں کے ہیں جو دنیا کے دوسرے سوار دستوں کے
ہم پلہ ہیں لیکن افغان و ہندوستانی جو پیادہ فوج میں ان سے گھٹے ہوئے ہیں سواروں کی حیثیت
سے ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مہاراجہ کے زمانے میں پیادہ فوج میں ملک کے چیدہ جوان
تھے اور اس میں صرف خوش رو و مضبوط لوگ منتخب کئے جاتے تھے اس کے برخلاف
سوار بے قاعدہ فوج تھی جو اس کے سرداروں کے لواحقین تھے اور بہادری یا طاقت کا
کوئی لحاظ ان کے بھرتی کرتے وقت نہیں کیا جاتا تھا۔ گھوڑے کم قد کے لاغر۔ دوغلے
اور ساز و سامان بھدا و بدقطع ہوتا تھا۔ آج کل کی سکھ ریاستوں میں فوج میں بھی جو سب
میری دیکھی ہوئی ہیں اور ان میں سے ایک کو خاص طور پر میں نے ہی مرتب کیا ہے وہی
طریقہ جاری ہے۔ پیادہ فوج قد و قامت اور ڈیل ڈول میں سکھوں کی انگریزی فوج کی سی
تھی لیکن سوار فوج ایسی بڈھی نحیف وظیفہ خواروں کا اسپتال ہو گئی ہے جو گھوڑے کی پیٹھ پر تو
بیٹھ سکتے ہیں لیکن نہ تو وہ حملہ کر سکتے اور نہ کوئی جسمانی طاقت کا کام انجام دے سکتے ہیں۔

میں نے اس سے قبل اکالیوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ خالصے کے زمانے میں پیادہ
فوج کی حیثیت سے سب سے زیادہ باوقعت سمجھے جاتے تھے مہاراجہ ان لوگوں کے بارے
میں زیادہ مداخلت کرنے سے ڈرتا تھا کیونکہ اگرچہ ان کی حالت مخمور وحشیوں سے کچھ ہی
بہتر تھی لیکن سکھ ان لوگوں کو ایک حد تک بزرگ مانتے تھے اور جب کبھی ایسے کام کے
سرانجام کی ضرورت پڑتی جس کی انجام دہی سے باقاعدہ فوج کے سپاہی و عہدہ دار انکار کرتے
تو یہی لوگ کام آتے تھے۔ ان ہی لوگوں نے مٹکاف کے مسلمان محافظ دستے پر ۱۸۰۹ء[1] میں

[1] سفیر کی تربیت یافتہ محافظ دستہ فوج نے جس مستعدی سے اکالی ہنگامہ آراؤں کو مار بھگایا اس سے رنجیت سنگھ پر

دیوانہ وار حملہ کر کے مہاراجہ کو انگریزوں سے تقریباً لڑا دیا۔ ان کی بے خوف جرائت نے بہت سی متزلزل لڑائیوں کو فتح سے مبدل کر دیا۔ یہ اپنی روش اور حملہ آوری کے طرز میں افغانستان وسوڈان کے غازیوں کے مشابہ تھے جن کے ہیبت ناک وسخت حملے سوائے باقاعدہ تربیت یافتہ اور تجربے کار فوج کے دوسروں کے چھکے چھڑا دیتے ہیں۔ لیکن سکھوں کی خدائی فوج کی جرائت بجائے اس جوش مذہبی کے جو اسلامیوں کے دل میں ہے فشیات کی وجہ سے ہے۔ مہاراجہ کے زمانے میں ان کی ضرر رسانی اور دھاک بہت بڑھی ہوئی تھی اور وہ ہمیشہ اس کے لئے خطرے کے باعث ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کئی بار اس کی جان لینے کی بھی کوشش کی تھی۔

ان کی گستاخانہ لاف زنی اور یورپین لوگوں سے تنفر کرنے انھیں انگریزوں کے قبضے و الحاق کے ابتدائی زمانے میں اس درجے مکروہ بنا رکھا تھا کہ امرتسر کے دربار صاحب کے مندر میں جو اکالیوں کا صدر مقام تھا انگریزوں کا جانا خالی از خطرہ نہ تھا۔ مہاراجہ یا تو بالکل غیر متعصب تھا اور یا کم از کم لاپروا تھا۔ اور وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کی مسلمان رعایا بلا مزاحمت مراسم مذہبی ادا کرنے کے مجاز ہوں۔ لیکن اس کو مجبور ہونا پڑا کہ اونچی آواز سے اذاں کی ممانعت کر دے کیونکہ اس کی آواز سے اکالی برافروختہ ہوتے تھے۔ مہاراجہ نے ان مذہبی دیوانوں کے ایک باقاعدہ گروہ بنانے کی کوشش کی اور اس لئے اس نے ایک فوج قائم کی جس میں ۳۰۰۰ ہزار بے قاعدہ سوار تھے لیکن اس کا بہت کم اثر ہوا۔ وہ ہمیشہ حملہ کرتے وقت گھوڑوں پر سے اتر پڑتے اور دو رخی تلوار استعمال کرتے تھے جو انھیں بہت عزیز تھی۔ لوہے کے چکر جو ہمیشہ ان کی پگڑیوں میں لگے رہتے تھے جن کا قطر ۶ سے ۱۰ انچ تک ہوتا تھا اور ان کے کنارے دھاردار ہوتے تھے ایسے خطرناک نہ تھے جیسے کہ وہ لوگ انکو تصور کرتے تھے۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ دوست دشمن سب کے لئے یکساں خطرناک تھے۔ مجھے کبھی کوئی ایسا اکالی نہیں ملا جو ان چکروں کو اچھی یا یقینی طور پر استعمال کر سکتا ہو۔ میں نے اکثر کامیابی کے ساتھ انھیں انکے خلاف استعمال کیا ہے۔ ان کی زد ساٹھ (۶۰) سے لے کر (۱۰۰) گز تک ہوتی ہے۔

پردیسیوں میں سے جو مہاراجہ کی ملاقات کے سلسلے میں داخل ہوئے جنرل ونٹورا

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ بڑا اثر پڑا اس کی وجہ سے نہ صرف اس کا رجحان صلح کرنے کے لئے ہوا بلکہ اس نے مستقل ارادہ کر لیا کہ اپنی فوج کو بھی اسی طرح ترتیب دے۔

سب سے زیادہ باوقعت تھا۔ وہ اطالیہ کا معزز و معروف شخص تھا۔ اس نے اسپین و اٹلی کی افواج میں نپولین کی ماتحتی میں خدمات انجام دی تھیں اور صلح کے بعد جب اس نے دیکھا کہ وہاں اس قسم کے کاموں کی قدر نہیں رہی تو وہ قسمت آزمائی کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ دنیا کے جس قطعۂ ملک میں اسے موقع ملا وہاں جا پہنچا۔ ایسی طرز و حیثیت کا ایک دوسرا شخص جنرل الرڈ تھا۔ یہ بھی نپولین کا ایک عہدہ دار تھا جو اپنی قابلیت و بہادری کے جوہر سے اکثر مہمات میں ممتاز رہا تھا۔ ان لوگوں نے پہلے تو اپنی قسمت آزمائی مصر و ایران میں کی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ شاہ عباس کے یہاں جو بادشاہ وقت تھا ان کی رسائی ناممکن ہے تو وہ ہرات و قندھار کے راستے سے ہندوستان چلے آئے۔ یہاں مہاراجہ نے بہت پس و پیش اور عرصے تک ان کے اوصاف کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد انھیں مامور کیا۔ دونوں نے رنجیت سنگھ کی خدمت نہایت وفاداری سے اور عرصے تک انجام دی۔ الرڈ کو سواروں کی فوج بھرتی کرنے کی اجازت دی گئی اور وینٹورا کو فوج خاص کی کمان سپرد کی گئی۔ یہ حصۂ فوج تربیت و ساز و سامان کے لحاظ سے تمام سکھ فوج میں اول درجے کا شمار ہوتا تھا اس کی اصلی تعداد ۴ پیادے اور ۲ سوار دستے تھے۔ اور اگرچہ مہاراجہ نے بعد میں اس میں اضافہ کر کے ۵ پیادے اور ۳ سوار دستے قائم کئے لیکن وینٹورا کی درخواست پر اسے پھر اگلی تعداد پر قائم کر دیا۔ جنرل وینٹورا نے اس فوج کے ہمراہ بہت سے مہمات میں کار ہائے نمایاں انجام دیئے علی الخصوص پہاڑیوں کے گرد اور پشاور کے اطراف میں مہاراجہ ہمیشہ اس کو معتبر سمجھتا اور اس کی عزت کرتا تھا۔ اسنے اسے لاہور کا قاضی یا صوبہ دار مقرر کیا جس کی وجہ سے دربار میں اس کا درجہ تیسرا شمار کیا جانے لگا۔ کرنل کورٹ جو فرانسیسی تھا اور جس نے پیرس کے اکولی پالٹیکنیک میں تعلیم پائی تھی گورکھا فوج کے دو دستوں پر سرکمان تھا۔ کرنل گارڈنر آیرلینڈ کا باشندہ تھا نہ اس کی تعلیم زیادہ ہوئی تھی اور نہ طور طریقہ پختہ تھا لیکن خاصی قابلیت رکھتا تھا۔ یہ شخص توپ خانے پر مامور کیا گیا[1]۔ کرنل وان کورٹلینڈ بھی ایک فوجی

---

[1] کرنل گارڈنر کو مرے ہوئے عرصہ ہوا۔ جب میں اس سے ملا تو وہ مہاراجہ کشمیر کا وظیفہ خوار تھا۔ اور ہمیشہ مخمور رہتا تھا۔ اس نے مجھے اپنا مسودہ پڑھنے کے لئے دیا جس میں مہاراجہ کے آخر عمر کے حالات اور اس کے مرنے کے بعد کے واقعات تحریر تھے۔ یہ دلچسپ تحریر جو مسٹر فریڈرک کو پرس بی ستونی کے تفویض کی گئی تھی تلف ہو گئی۔ تاریخی لحاظ سے اس کا تلف ہونا نقصان عظیم تصور کیا جاتا ہے۔

عہدہ دار تھا۔ یہ شخص مخلوط النسل تھا۔ سکھوں کی حکومت کے زوال کے بعد یہ شخص سرکار انگریزی کے ملکی شعبۂ ملازمت میں داخل ہوا۔ اور غدر کے زمانے میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جنرل ایوٹ ایبائل نیپلس کا باشندہ تھا۔ ایران میں ملازمت کرنے کے بعد وہ وینٹورا کے آنے کے چند سال بعد لاہور آیا۔ یہ عام طور پر انتظامی خدمات پر مامور کیا جاتا رہا۔ سب سے پہلے راوی وچناب کے مابین کے قطعہ ملک رچنا دوآب پر مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک پنجاب کے شورش خیز قطعہ ضلع پشاور پر جہاں اس کے سخت وحشتناک طور وطریقوں نے اس وحشی قطعہ میں رہکر ایسا امن قائم کر دیا تھا جو اس ملک کی تاریخ میں پہلا موقعہ تھا خیبر کے گرد و اطراف میں متمرد جرگوں میں اب تک اس کے نام سے لوگ دہشت کرتے ہیں۔ اس نے ان چور و قاتلوں کی تعداد کثیر کو شہر کے فصیل کے گرد سولیاں دی تھیں۔ اسکا سزا دہی کا طریقہ نہایت سخت تھا اور اگرچہ انگریزوں کا طریقہ اس ہیبتناک اطالوی شخص کے مقابلے میں بہت نرم ہے لیکن پھر بھی جن لوگوں کو شمالی مغربی سرحد پر نظم و نسق قائم رکھنا پڑتا ہے انھیں تعجیل وسخت گیری سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہائی کورٹ اور بیرسٹر ججوں کے ذریعے سے آہستہ وطول طویل کارروائی کرنا ایسے مواقع پر حماقت ہے جہاں مجرم کا فوراً تعاقب کر کے اسے عین مصروفیت کی حالت میں گرفتار کر لیا جائے قبل اس کے کہ وہ پہاڑیوں میں پہنچکر محفوظ ہو جائے۔ ایسی حالت میں سرسری اقرار جرم کے بعد کسی قریب کے درخت پر اسے لٹکا دینا مناسب ہے بڑ

پردیسیوں نے جو مہاراجہ کی ملازمت میں داخل تھے خصوصاً جنرل وینٹورا جو فوج خاص کی کمان پر مامور کیا گیا تھا اور کورٹ جو اس فوج کی کمان پہ مقرر کیا گیا تھا جو فرانسیسی فوج کے نام سے موسوم تھی رنجیت سنگھ کے فوج کی تربیت اور قواعد میں بہت کچھ ترقی دی۔ یہ لوگ فوجی مہمات کے موقعوں پر افواج کے سپہ سالار مقرر نہیں کیئے جاتے تھے کیونکہ یہ خدمت برائے نام شہزادوں یعنی کھڑک سنگھ۔ شیر سنگھ یا دوسرے بڑے بڑے سرداروں کے تفویض کی جاتی تھی۔ مہاراجہ کے تمام اعلیٰ فوجی افسروں میں دیوان مکھ چند سب سے اچھا تھا۔ یہ شخص ذات کا کھتری تھا۔ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۴ء تک جب کہ اس کا انتقال ہوا تمام سکھ فوج کا درحقیقت یہی سپہ سالار اور مہاراجہ کے تمام فتوحات میں اُس کا شریک تھا۔ اس کا پوتا رام دیال بھی جو ۱۸۲۰ء میں ہزارا میں مارا گیا بہت ہوشیار فوجی افسر تھا۔ اگر وہ جیتا رہتا تو

ممکن ہے کہ بڑا نام پیدا کرتا۔ مسر دیوان چند نے جو ہندوؤں کی تجارت پیشہ ذات کا تھا اور اس وجہ سے سکھ اس سے نفرت کرتے تھے ۱۸۱۸ء میں ملتان فتح کیا۔ اس کے دوسرے سال اس کی سرکردگی میں کشمیر پر فوج روانہ کی گئی جسے کامیابی نصیب ہوئی۔ سکھ سرداروں میں جو لوگ زیادہ ممتاز رہے وہ سردار فتح سنگھ کلیاں والہ۔ سردار نہال سنگھ اٹاری والہ جس نے ۱۸۰۱ء سے ۱۸۳۷ء تک مہاراجہ کے تمام مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے سردار فتح سنگھ اہلووالیہ جو مہاراجگان کپورتھلہ کے اجداد میں سے تھا۔ سردار بدھ سنگھ سندھن والیہ اور اس کا بھائی عطر سنگھ تھے۔ عطر سنگھ سردار ہری سنگھ نلوا کے ۱۸۳۶ء میں جمرود میں انتقال کرنے کے بعد خالصے کا سورما مانا جاتا تھا۔ ہری سنگھ بڑا جری و بہادر سردار تھا۔ فوج والے اس سے بے انتہا الفت کرتے تھے گو مخالف کے لشکر کی تعداد کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ حملہ کرنے اور فتح حاصل کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ اس کے بیٹے جواہر سنگھ میں جو میرا بڑا دوست تھا باپ کے تمام اوصاف موجود تھے۔ اس شخص نے بے قاعدہ سواروں کے دستے کے ساتھ بڑی عمدگی سے چلیان والہ میں انگریزوں پر حملہ کیا جس کے باعث سے فتح آفت و مصیبت سے تقریباً مبدل ہو گئی۔ میں مہاراجہ کے اور بہت سے مشہور فوجی عہدہ داروں کے نام بیان کر سکتا ہوں جو اب تک پنجاب میں زبان زد خاص وعام ہیں لیکن انگریز ناظرین کو اس سے دلچسپی نہ ہو گی۔

رنجیت سنگھ اور اس کے جانشینوں کے زمانے کے فوج کی ترکیب کے بارے میں پوری واقفیت تنخواہوں کی برآورد اور قبض الوصول کے نقشوں سے ملتی ہے جو ۱۸۴۶ء میں پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد لاہور کے دفاتر سے دستیاب ہوئی۔ فوج خاص کی ترکیب جو جنرل ونٹورا کے زیر نگرانی تھی تمثیلاً بیان کی جاتی ہے۔ جنرل ونٹورا نے اس فتنہ وفساد سے تنگ آکر جس میں یوماً فیوماً ترقی ہو رہی تھی اور آنے والی تباہی کے اندیشے سے جس کا پیش آنا لازمی تھا ۱۸۴۳ء میں استعفا دیدیا۔ مہاراجہ کے مرنے کے بعد اس وقت تک اس نے استعفا نہیں دیا جب تک اسے عملاً یہ ثابت نہ ہو گیا کہ مہاراجہ کے بعد سلک ملازمت میں رہنا اندیشہ ناک ہے۔ کیونکہ جنرل کورٹ کی فوج کی تین پلٹنوں نے اس برادر خود جنرل کورٹ پر حملہ کیا اور ونٹورا کو مجبوراً اپنی اور اپنے ست کی حفاظت کے لئے اپنے توپخانے سے کام لینا پڑا۔

فوج خاص کی ترکیب ۱۸۴۵ء میں جنگ ستلج سے قبل حسب ذیل تھی :-

فوج باقاعدہ پیادہ ——— ۳۱۷۶

فوج باقاعدہ سوار ——— ۱۶۶۷

توپخانہ مع ۳۴ ضرب توپ ——— ۸۵۵

جملہ ۵۶۹۸

پیادہ فوج کے خاص پلٹن میں (۸۲۰) سپاہی تھے۔ گورکھا پلٹن میں (۷۰۰) سپاہی تھے۔ دیوا سنگھ کی پلٹن میں ۸۲۹ سپاہی تھے اور شام سوتا پلٹن میں ۸۱۰ سپاہی تھے۔ یہ سب پیادہ سپاہ میں داخل تھے؛

سوار فوج میں گرانڈیل رجمنٹ جس میں ۷۲۰ نفر تھے۔ سہ نیم سوار وراگوں رجمنٹ جن کی تعداد ۷۵۰ تھی اور اسی میں شاہی محافظ دستہ شامل تھا جس میں ۱۸۷ آدمی تھے؛

توپخانہ الٰہی بخش کے پارے نام تھا جو اسی نام کے ایک مسلمان فوجی افسر کے زیر کمان تھا۔ یہ شخص سکھ فوج میں بہترین افسر توپ خانہ تھا؛

تمام فوج کی تنخواہ ۹۶۰۶۷ روپے ماہانہ (یہ رقم اس وقت ۱۰ ہزار پاونڈ کے قریب تھی) تھی؛

۱۸۳۹ء میں مہاراجہ کی وفات ہوئی۔ اس کے انتقال کے بعد فوج کی ترکیب میں بڑا تغیر واقع ہوا۔ اُس کے قوت واقتدار نے بغاوت و شکوہ شکایت کو دبائے رکھا تھا گو خود اسے ایک مرتبہ گوبند گڑھ کے قلعے میں گورکھا پلٹن کے غصے سے پناہ لینی پڑی جو بقایا تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بگڑ گئی تھی۔ اس کے جانشین اپنی جان کے جانے و حکومت کے ضایع ہونے کے خوف سے فوج کی تعداد و تنخواہ میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوئے یہاں تک کہ یہ فوج ریاست کے لیئے بار گراں ہو گئی کہ اس کو برداشت کرنا مشکل تھا اور ساتھ ہی دوسری سلطنتوں کے لیئے مستقل خطرہ بن گئی؛

مہاراجہ کے انتقال اور اس کے جانشینوں کے وقت باقاعدہ فوج۔ پیادہ۔ سوار اور توپ خانے کی تعداد و مصارف کا اندازہ گوشوارہ ذیل سے ہوگا :-

	تعداد	توپیں	اخراجات (روپیہ)
۱۸۳۹ء مہاراجہ رنجیت سنگھ	۲۹۱۶۸	۱۹۲	۳۸۲۰۸۸

	تعداد	توپیں	اخراجات روپیہ
۴۲-۱۸۴۰ء مہاراجہ شیر سنگھ	۵۰۰۶۵	۲۳۲	۵۴۸۶۰۳
۱۸۴۴ء راجہ ہیرا سنگھ	۵۰۸۰۵	۲۸۲	۶۸۲۹۸۴
۱۸۴۵ء سردار جواہر سنگھ	۷۲۳۷۰	۳۸۱	۸۵۲۶۹۶

جواہر سنگھ کے زمانے میں توپوں کی تعداد میں جو اضافہ ہوا وہ برائے نام تھا۔ نئی توپیں بہت کم ڈھالی گئیں مگر قلعوں پر کی پرانی توپوں کو صیقل کر کے پھڑپھیوں پر لگادی گئی تھیں بے قاعدہ سواروں کی تعداد میں باقاعدہ فوج کی مناسبت سے اضافہ نہیں ہوا۔ ستلج کی لڑائی کی ابتدا یعنی ۱۸۴۵ء میں اس کی تعداد ۱۶۲۹۲ تھی ؛

تمام پنجاب میں فوج کی تعداد اس وقت حسب ذیل تھی :۔

باقاعدہ پیادہ فوج ———— ۵۳۷۵۶

باقاعدہ سوار ———— ۶۲۳۵

بے قاعدہ سوار ———— ۱۶۲۹۲

توپ خانہ ———— ۱۰۹۶۸

شتری توپ خانہ ———— ۵۸۴

متفرق ———— ۸۲۷

————

جملہ ۸۸۶۶۲

توپیں۔ فیلڈ باٹری ۳۸۰۔ قلعوں کی توپیں ۱۰۴ جملہ ۴۸۴۔ شتری توپ خانہ ۳۰۸۔

بے قاعدہ جمعیت فوج اور جاگیرداروں کی امدادی سوار فوج کا شمار مندرجہ بالا گوشوارے میں نہیں کیا گیا ہے کیونکہ اس کے متعلق صحیح مواد فراہم نہیں ہو سکتا۔ اندازاً اس کی تعداد ۳۰۰۰۰ سپاہ کے قریب تھی۔ مہاراجہ کے فوجی معاینے کے مواقع پر اس فوج کا منظر خوشنما ہوتا تھا۔ اس میں بہت سے اشخاص آسودہ حال شرفا تھے جو ان سرداروں کی اولاد یا اعزا تھے جن کو فوج میں داخل کر دیا تھا وہی رئیس خبر گیری کرتے تھے اور ان لوگوں کی خوشنمائی سے ان کی وقعت بڑھتی تھی۔ ان کے لباس یکساں نہ تھے۔ بعض زرہ بکتر پہنتے اور سر پر خود رکھتے تھے جن میں طلائی کام اور پروں کا طرہ یا کلغی ہوتی تھی۔ بعض

مختلف رنگوں کے مخملی لباس - گلابی یا زرد پگڑی اور طلائی کام کے پٹکے باندھتے زرق برق لباس میں نظر آتے تھے - طلائی پٹکوں پر تلوار و باروت کا سینگ پڑا لگا رہتا تھا - سب لوگوں کی پشت پر چھوٹی سی گندہ گاومیش کی ادھوڑی کی گول سپر رہتی تھی - ان عظیم الشان شہ سواروں میں کچھ تو تیر کمان سے مسلح ہوتے تھے اور زیادہ توڑے دار بندوقوں سے جن سے خاصی قدر اندازی کرتے تھے ؎

باقاعدہ سوار فوج جاگیرداروں کی امدادی سوار فوج کی طرح زرق برق نہ تھی - اس فوج کی انگریزی فوج کی نقل سرخ بانات کی چست وردی تھی - جو ہندوستانی فوجوں پر کسی طرح زیب نہیں دیتی ان کی تنخواہ کمپنی کی فوج کی تنخواہ سے مناسبتاً معقول تھی - ۱۰ روپے ماہانہ پیادہ کو ملتے تھے لیکن انھیں کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا تھا - سواروں کو ۲۵ روپے دیئے جاتے تھے کیونکہ انھیں گھوڑا اور سامان اپنا رکھنا پڑتا تھا ؎

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ملکی انتظام کے بارے میں کسی طولانی بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ غریب کاشتکار سے دام دام جو اس کے پاس تھا چھین لیا جاتا تھا - ظلم و زیادتی کی روک صرف اس اندیشے سے ہوتی تھی کہ کاشتکار بغاوت نہ کریں یا بددل و ناامید ہو کر اراضی ترک کر کے نہ چلے جائیں - اصل یہ ہے سکھ زمیندار اس مرغی کو جان سے مارنا پسند نہ کرتے تھے جو سونے کا انڈا دیتی تھی لیکن اس کے پر ایک ایک کر کے جہاں تک بس تھا نوچ لیتے تھے - بندوبست اراضی کے رپورٹ کے چند فقرات کے یہاں اعادہ کرنے سے ظاہر ہوگا کہ سرکار انگریزی کے عہدہ دار سکھوں کے اس طریقے کو کس نظر سے دیکھتے تھے - سرکار انگریزی کے عہدہ دار جس طرح پر انتظام کرتے تھے وہ سکھوں کے طریقے سے ایسا ہی مختلف ہے جیسا تاریکی سے روشنی - اور اصل یہ ہے کہ اس طریقے میں سرکار انگریزی سخاوت کے برتاو میں زیادتی کر کے غلطی کرتی ہے کاشتکاروں سے اتنی نرمی برتی جاتی جس کے وہ مستحق نہیں - سرکار انگریزی بلا معقول وجوہ شکایت اس حصہ لگان میں بہت کچھ اضافہ کر سکتی ہے جو وہ ہندوستان کے وسیع قطعات اراضی سے بطور محاصل وصول کرتی ہے - میں نے پنجاب کی رپورٹ نظم و نسق بابتہ سنہ ۷۳-۱۸۷۲ء میں یہ تحریر کیا تھا کہ :-

"سکھ درحقیقت زمین کی پیداوار خام کا نصف حصہ تک لے لیا کرتے تھے اور اس کے

علاوہ بہت سے ابواب تھے جو ان لوگوں کو ادا کرنے پڑتے تھے۔ اس کے برخلاف ہمارا مطالبہ کبھی چھٹے حصے سے زیادہ نہیں ہوا اور اکثر تو آٹھویں دسویں اور بارھویں حصے سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔ بعض صورتوں میں تو اوسط پیداوار کے اوسط نرخ کے حساب سے پندرھواں حصہ بیس سے لیکر تیس سال تک معین کر دیا گیا ہے"؛

رنجیت سنگھ کے آخری زمانے میں چنگی کی آمدنی ۱۶۳۷۰۰۰ روپے اور اخراجات وصول ۱۱۰۰۰ روپے یا تقریباً ۷ فی صدی تھے ۴۸ مدات کے متعلق چنگی وصول کیجاتی تھی۔ تقریباً روزمرہ کی ہر قابل استعمال شے پر جس میں شوقینی اور ضرورت کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ غربا کے استعمال کی چیزیں مثلاً ایندھن۔ غلّہ۔ یا ترکاری پر کسی کم شرح سے چنگی وصول نہ کی جاتی تھی۔ وصول کرنے کا طریقہ نہایت آزاردہ تھا۔ تمام ملک میں چنگی کی چوکیاں قائم تھیں جہاں تجار کے ساتھ نہایت بدتمیزی اور جبر کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ سامان جب شہر میں داخل ہوتا تو اس پر محصول لیا جاتا۔ دوسری مرتبہ جب وہ دکان پر جاتا تو محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اگر اس کو پھر شہر سے باہر روانہ کیا جاتا تو تیسری دفعہ اس پر محصول عائد کیا جاتا تھا؛

مسٹر ایبٹسن نے بندوبست کی رپورٹ سے اقتباسات ذیل اخذ کرکے اپنی قابل قدر رپورٹ مردم شماری بابتہ ۱۸۸۳ء میں شایع کیئے ہیں اس سے نہایت وضاحت سے سکھوں کا طریقہ نظم ونسق معلوم ہوتا ہے اور چونکہ وہ مختلف اضلاع اور مختلف اسناد پر مبنی ہے اس لیئے کسی شخص واحد کی رائے کے مقابلے میں اس سے زیادہ ترصیح اندازہ اس طریقے کا ہوسکتا ہے[1]؛

---

[1] پنجاب کی بندوبست اراضی کی رپورٹوں میں تمدنی۔ مالی اور تاریخی امور کے متعلق دلچسپ معلومات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ رپورٹیں انگریزی عہدہ داروں کی جانفشانی وقابلیت کی عمدہ یادگاریں ہیں اور ہمیشہ رہینگی۔ ضلع کانگڑا کے متعلق مسٹر بارنس کی اصل رپورٹ ایک بلند پایہ ادبی تصنیف ہے۔ اور ویسی ہی اسی ضلع کی دوسری رپورٹ سرجے بی لایل کی مرتب کی ہوئی۔ پشاور کی رپورٹ مرتبہ کپتان جیمس قابل قدر معلومات سے مملو ہے۔ پنجاب یا ہندوستان کے دوسرے حصے میں اسبارے میں جو کوشش کی گئی ان میں سے کوئی پائدار دلچسپی فلسفیانہ استخراج جانفشانی اور ادبی لحاظ سے ہمارے بعض نوجوان

سب سے پہلے سرحد پشاور کو لو۔ کپتان جیمس نے تحریر کیا ہے کہ :۔

"۱۸۰۰ء سے لیکر ۱۸۲۰ء تک پشاور میں متواتر ہل چل مچی رہی۔ اس عرصے میں اس کے حکمران برابر بدلتے رہے۔ مگر ان میں کوئی بھی وحشی باشندوں پر حقیقی حکومت نہ کر سکا۔ پہاڑی جرگے اسی کا ساتھ دیتے جس سے سب سے زیادہ وصول ہوتا۔ سکھوں کا وقتاً فوقتاً اس سمت میں آنا وہاں کے باشندوں کے لیئے بلائے جان تھا۔ ان کا وہاں پہنچنا اس امر کی علامت تھی کہ مال ومتاع اور بیش قیمت اسباب کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے یہاں تک کہ دروازے اور کھڑکیاں تک نکال لی جاتی تھیں۔ عورتیں اور بچے کثیر تعداد میں گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور ملک میں جلاوطنوں کی نوآبادیاں نظر آیا کرتیں یہ نفرت زدہ دشمن جہاں تک آگے بڑھتے تمام قطعہ ملک کو برباد کرتے جاتے اور جو کچھ سامنے آتا اسے تاخت وتاراج کرتے اور کھیتوں اور زراعتوں تک تباہ کر دیتے۔ وادی کے دہانے سے لیکر دریائے سندھ تک شاید ہی کوئی موضع ایسا ہو جسے سکھ فوجی افسر نے نہ لوٹا ہو اور وہاں آگ نہ لگائی ہو۔ ان کی آمد سے اس درجہ خوف سمایا ہوا تھا کہ مائیں اپنے ضدی بچوں کو اس کا نام لیکر خاموش کرتیں۔ اس ملک میں آج بھی سفر کرتے وقت بوڑھے جن کی لمبی سفید ڈاڑھیاں اور چہروں پر کثرت سے زخموں کے نشان ہیں ان پہاڑیوں کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں سکھ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کو ہنکا دیتے تھے اور جوان لوگ اب تک ان مقامات کو بتا سکتے ہیں جہاں ان کے آباواجداد لڑ بھڑ کے گرے تھے۔ ان کے آنے سے تباہی وبربادی کا لوگوں کو اسدرجہ یقین تھا کہ چند گاؤں جہاں راستوں کی دشواری سے پہنچ نہ ہوتی دشمن یا تو بالکل چھوڑ دیتے تھے اور یا مدافعت کی وجہ صرف ایک حصہ اُس کا انھیں بہ ہئیت مجموعی کم برباد کر سکے تھے۔ ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ ان کو ایک زبردست فتح نمایاں اپنے دشمن پر حاصل ہوئی"

لیکن اس بد قسمت ضلع کے باشندوں کو سکھوں کے واپس جانے کے بعد کے

بقیہ مضمون صفحۂ گذشتہ۔ سیو ملیلینوں شلاً پرسر۔ تھاربرن۔ ایٹیسن۔ ولسن۔ اور ادبرین وغیرہ کی مرتبہ رپورٹوں پر سبقت نہیں لے جا سکتی۔

وقفے میں بھی چین نصیب نہ ہوتا۔ اس امر کا اندازہ مشکل ہے کہ آیا سکھوں کے ان خوفناک گروقتیہ حملوں نے ان لوگوں کو زیادہ نقصان پہنچایا یا انکی باہمی خانہ جنگیوں نے جو ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے سے ہوا کرتی تھیں اور ایسے افعال یا تو اس وجہ سے سرزد ہوتے تھے کہ حملہ آور رعنایت کا برتاؤ کریں یا اپنے ذاتی کینہ وانتقام لینے کے خیال سے وہ ان کے ساتھ ہو گئے کیونکہ جیسا پست حالت اقوام کی عموماً عادت ہوتی ہے۔ ان اغراض کے لیئے ایک دوسرے کے ساتھ دغا کرنے اور جاسوس یا مخبر بن کر اپنے ہمسایوں کو سکھوں کے مظالم میں گرفتار کرا دینے میں ان لوگوں کو کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ اور اس درجہ کمینہ پن کرتے تھے کہ اگر ان کے آباؤ اجداد زندہ ہوتے تو وہ ان افعال سے سخت تنفر کرتے چچکیاں کے سردار کو سکھوں نے جن شرائط پر راضی دی تھی ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ ہر سال ۲۰ آفریدیوں کے سر پیش کیئے جائیں۔ بڈھا سردار اُن دغا بازیوں کو بیان کرنے سے نہیں شرماتا ہے جو اس شرط کی تکمیل کے لیئے اسے بعض اوقات عمل میں لانا پڑتے تھے"۔

کرنل کراکرافٹ اور مسٹر ای ایل برینڈ رتھ کے اضلاع راولپنڈی وجہلم کی بندوبست کی رپورٹ میں ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ:۔

"صدیوں سے فتنہ وفساد پھیلا ہوا تھا اور بہت زمانہ قدیم سے اس ضلع پر یونانیوں سے لیکے افغانوں تک کے گروہ حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ وہ آندھی کی طرح ایک بار ہی نازل ہوتے ضلع کا صفایا کر جاتے تھے اور پھر غائب ہو جاتے۔ عارضی بربادی۔ لوٹے ہوئے مکانات اور ویران گھر وقتیہ وقتی بلائیں تھیں اور اب لوگ ان کو بھول گئے ہیں۔ لیکن اصل میں یہ کام سکھ کارداروں کا ہی تھا جو لاہور سے اتنے دور بیٹھے تھے ان پر کسی قسم کی نگرانی قائم رہ سکتی تھی۔ کہ انھوں نے گکھڑ اور راجپوت کو اس افلاس کی حالت پر پہنچا دیا۔ ان کی حکومت فوجی مطلق العنان جبریت تھی اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسے تمام فرقوں وخاندانوں کو نیست ونابود کر دیا جائے جنھیں حکومت کا کوئی دعوی ہو اور اس لیئے وہ گکھڑوں اور ان لوگوں کے مقابلے میں جو انتظام ملک میں ان کے شریک تھے سخت ترین تدابیر عمل میں لاتے تھے۔ اسی وجہ سے ان میں محض خانہ بدوشی ذلیل افلاس کی نوبت پہنچی یہاں تک کہ پہلے جو لوگ ان کے ہرواہے تھے اب یہ لوگ خود ان کی رعایا اور کاشتکار ہیں۔ عام راستے عموماً غیر محفوظ تھے مختلف اقوام کی حدود سے گذرنے کے لیئے

مسافروں اور قافلوں کو ان لوگوں کو دے دلا کر ان کے حرص و طمع کی آگ بجھانی پڑتی تھی یا انھیں یہ گوارا کرنا پڑتا تھا کہ وہ لوگ انھیں لوٹیں اور عفت ریزی اور بدسلوکی کریں اور بعض اوقات تو بقول شخصے "جان بچی تو لاکھوں پائے" کی نوبت ہوتی تھی"۔

اضلاع متوسط میں سکھوں کی حکومت کے بارے میں مسٹر ایبٹسن نے تحریر کیا ہے کہ:

"اُس صوبے کے وسط جنوب مغرب میں سکھوں کی حکومت زبردست اور سب جگھوں کی نسبت سے منصفانہ تھی۔ مسلوں کی نمود و ترقی سے پہلے درحقیقت اس کی حالت عام قتل و غارتگری کے نظام سے بہتر نہ تھی لیکن جب سکھوں نے ایک جمعیت کی حیثیت پیدا کر لی اور ان میں قومی جذبات پیدا ہو گئے۔ اگر اور کسی وجہ سے نہیں تو کم از کم خود غرضی کے خیال سے ان کی حکومت میں اعتدال قائم ہو گیا۔ تاہم جیسا کہ سر رابرٹ اجرٹن نے تحریر کیا ہے سکھ آبادی کا ہر فرد بشر سپاہی تھا اور ان کا ایک ہی مقصد تھا وہ یہ کہ ہندو مسلمان کاشتکاروں سے بغیر اس کے کہ انھیں کھیتوں کے چھوڑنے پر مجبور کیا جائے جہاں تک ہو سکے دام دام وصول کر لیا جائے۔ راجپوت جنھوں نے اپنی ذات کی تحقیر کے خیال سے ایک ایسے جتھے میں شریک ہونے سے انکار کیا تھا جس میں ذات پات کا لحاظ نہ تھا اور اونچی ذات والوں کی کوئی قدر نہ تھی ان کے نفرت و ظلم کا خصوصیت کے ساتھ نشانہ بن گئے تھے۔ ان کی عدم شرکت مخالفت تصور کی جاتی تھی اور جس کسی کے پاس نام چار کو دولت یا اسے کوئی اقتدار حاصل تھا اس کو بے رحمی سے پامال کیا جاتا تھا۔ اسی طریقے کو مدنظر رکھتے ہوئے جس میں کاشتکاروں کی بہت ہی کم حوصلہ افزائی ہوتی ہے جہاں تک ان سے ہو سکا انھوں نے زراعت میں ترقی و توسیع کی لیکن انھوں نے کاشتکار سے بالاتر کسی کو نہ مانا۔ انھوں نے کوئی حقوق ملحوظ نہ رکھے اور نہ کبھی ایسی جائداد کو تسلیم کیا جہاں ایسے حقوق تسلیم کرنے سے ان کے مالی فوائد پر مخالف اثر پڑتا۔ جو شخص سکھ اور اس لئے سپاہی نہ ہوتا اس کی قدر اس حیثیت سے کی جاتی کہ اس سے لگان وصول کیا جا سکیگا۔ ان کی حکومت اس لحاظ سے باقاعدہ اور غیر جانب دار تھی کہ وہ سب کے ساتھ یکساں جبر و تعدی کرتے تھے"۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئیے کہ راجپوت قوم کی پہاڑیوں میں سکھوں کی حکومت کس قسم کی تھی۔ کوتاہ اندیش راجاؤں نے اپنے خانگی تنازعات کی وجہ سے گورکھوں کو اپنے

ہاں بلالیا تھا اور جیسا کہ مینڈک اور بگلے کی حکایت مشہور ہے ان وحشی گروہ نے کانگڑا اور شیلے کی پہاڑیوں میں ایک اودھم مچا رکھا تھا یہاں تک کہ تین برس کے فتنہ وفساد سے کانگڑا کی خوشنما وادی جنگل بن گئی اور شہر ویران ہو گئے۔ایسے وقت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کو مدد کے لیئے طلب کیا گیا اور گورکھا ٹڈی دل کی طرح سے بھاگ گئے۔ لیکن مہاراجہ کے سکھ کاردار کچھ ان سے بہتر نہ تھے۔مسٹر بارنس نے ضلع کانگڑا کی رپورٹ بندوبست اراضی میں تجویز کیا ہے کہ:-

"کاردار عدالت ونیز مال کا عہدہ دار ہوتا تھا۔لیکن اس کی مالی خدمات زیادہ اہم تھیں فیصلے جو رشوت لینے کے بعد صادر کیئے جاتے تھے یا ناکافی پولیس ایسی خرابیاں تھیں گو کہ ان کی جانب توجہ بھی ہو تو بھی نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔لیکن اگر کاردار کے محاصل شاہی کی ادائی میں کچھ بقایا رہ جائے تو حکومت کے ہاتھ سے اس کا بچاؤ اور معافی بالکل ناممکن تھی۔اس لیئے اس کی زندگی کا فریضہ اعظم یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کاشت میں وسعت دے اور اسی کے ساتھ کاشتکار کو جتنا ہو سکے مفلس بنائے رکھے۔لوگوں پر اتنا بار ڈالا جاتا تھا جتنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ برداشت کر سکتے تھے اور تحمل کی حدیں گذر گئی تھیں۔دیسی تحصیلدار ایسا بیوقوف نہ تھا کہ کاشتکار کو بالکل مٹا دے لیکن مٹا دینے کے سوا اور کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ سوائے اُس مقدار کے جو کاشتکار کے آزوقے کے لیئے کافی ہو جھنجی کوڑی اُس کے پاس نہ بچے۔لگان عموماً یکساں تھا اور اس کا بار جو یقیناً نرمی اور انصاف کے اصول سے گراں تھا سب کو یکساں برداشت کرنا پڑتا تھا"۔

دیوان ساون مل ملتان۔لیہ۔ڈیرہ غازی خاں۔خان کانگڑہ اور جھنگ کا صوبہ دار مہاراجہ کے تمام عمال سے بہتر تھا۔لیکن اوبرائن جس نے اس کے ایک ضلع مظفر گڑھ کا بندوبست کیا تھا اس کے متعلق یہ تحریر کیا ہے کہ:-

"دیوان ساون مل کی حکومت اس کے ماقبل کی حالت سے بہت اچھی تھی۔ اس کی اصل غرض وغایت دیوان کے لیئے دولت فراہم کرنا تھا۔تعمیرات کا کام۔ دادرسی۔جان ومال کی حفاظت ضمنی امور تھے اور صرف اسی وجہ سے ان پر زور دیا جاتا تھا کہ بغیر ان کے زراعت کو فروغ اور مالگزاری کی رقم ادا نہ ہو سکتی تھی۔جب کوئی شخص

اس کے عائد کردہ ابواب پر غور کرتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح محصولات وصول کرکے لوگوں کو خیرات دیتا ان کے مراسم مذہبی ادا کرتا اپنے نزدیک ایک معقول رقم مساکین و برہمنوں کو دیتا اور باقی اپنی جیب میں داخل کر لیتا۔ اپنے وعدوں کے ایفا کے لیئے لوگوں سے کس طرح رقم اینٹھتا اور اپنے عہدہ داروں کو رشوت لینے کی ترغیب دیتا اور پھر وہ رقم خزانے میں داخل کرا لیتا تو جو وقعت اس کے تاریخی حالات کے پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے بدرجہا کم اس مشاہدے کے بعد ہوتی ہے[1]"

ایسے اقتباس کی تائید میں اور سیکڑوں اقتباس انگریزی عہدہ داروں کے لکھے ہوئے پیش کیئے جا سکتے ہیں جنھیں پنجاب کے الحاق کے ۴۴ سال بعد تک پنجاب کے زخم کے اندمال کی کوشش اور اس مدتوں کے اجڑے ہوئے ملک میں دوبارہ خوش حالی۔ آسودگی اور امن چین پھیلانے کی تدابیر عمل میں لانا پڑیں۔ لیکن ہندوستان اور انگلستان کے ان لوگوں کے لیئے صرف اتنے ہی اقتباس کا نقل کر دینا سبق آموز ہے

---

[1] یعنے اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں کہ دیوان کی کارروائی کے جو واقعات اور بیان کیئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اس کے انتظام کے بارے میں میں نے اپنی کتاب میں جو میں اس کی اور اس کے ظالم بیٹے دیوان مولراج کی سوانح عمری کے بیان کیئے ہیں زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے۔ اس کے بیٹے کی دغابازی دوسری جنگ سکھ کا زیادہ تر باعث ہوئی۔ مسٹر اوبرائن نے انتظامات کے جو خصوصیات بیان کیئے ہیں وہ ہندوستانیوں کی نگاہ میں قابل عفو ہیں۔ اور دیسی انتظام کی عموماً یہی حالت ہے میرا بیان ذاتی تجربے کی بنا پر ہے کیونکہ مجھے کم از کم شمالی اور وسطی ہند کے ۰۰ ا ریاستوں کے انتظامات سے پوری پوری واقفیت ہے۔ دیوان ساون مل بہ حیثیت مجموعی دانشمند و نیک نہاد صوبہ دار تھا اور گو وہ رشوت لیتا تھا لیکن جابر نہ تھا۔ اس نے ویرانے کو عمدہ کھیتوں کی شکل میں مبدل کر دیا۔ لوگ ابتک اس کو وقعت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اس کا بیٹا کرم نارائن بھی بہت ہردلعزیز تھا لیکن مولراج سے عموماً لوگ نفرت کرتے تھے۔ "زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو"۔ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ ملتان میں ساون (مینہ کا مہینہ) لیہہ من کرم (نوازش) اور جھنگ میں جمو لمراج کا ضلع تھا مولا (اناج برباد کرنے والا کیڑا) تھا۔

جو دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انگریزی حکومت سخت گیر و جابر ہے اور جو ہماری قوم کے ہندوستان میں روشن خیالی سے حکومت کرنے کی عظمت کو قابل سرزنش و شرم تصور کرتے ہیں - انتظام کرنے والے اس سبق کو پڑھ سکتے ہیں۔ جو کام ہم نے ہندوستان میں کیا ہے وہ ایسے جلی حروف میں ہے کہ تمام آنکھیں سوائے ان کے جو آنکھ ہی بند کرلیں اور دیکھنا نہ چاہیں اسے دیکھ سکتے ہیں۔ فتنہ وفساد - قحط اور لوٹ مار کی بجائے باقاعدگی اور انصاف کا دورہ ہوا جس کی رو سے ہر شخص اپنی املاک سے مستفید ہوتا اور کوئی اسے ڈرا دھمکا نہ سکتا۔ سکھ ۱۲ شلنگ میں سے ۶ شلنگ لگان وصول کرتے تھے - سرکار انگریزی صرف دو یا ایک وصول کرتی ہے آبادی بہت بڑھ گئی ہے اور زراعت مناسبتاً روبہ ترقی ہے۔ اگر انگلستان آج اپنا دست حفاظت کھینچ لے اور اگر "وہ برطانیہ کی جے" کے خاتمے کا اعلان کروے اور ہندوستان سے علیحدگی اختیار کرکے اپنے فرائض وحقوق سے بزدلانہ طور پر دست بردار ہو جائے تو کیا کوئی سمجھ دار اس امر میں شک کرے گا کہ فتنہ وفساد پر پھر عود کر آئے گا - سکھ - مرہٹے اور افغان جان توڑ لڑائی میں پھر مصروف ہو جائینگے - حملہ آوروں کے تیغ و سنان پر بچے بلند کیئے جائینگے اور پنجاب کی دوشیزہ لڑکیاں حسن پرستوں کا شکار بنیں گے اور دہلی اور لاہور کی فصیلیں آتش زدہ مواضعات کی روشنی سے جگمگائیں گی ؎

باب ہشتم

اس کے ابتدائی فتوحات

مہاراجہ رنجیت سنگھ مہان سنگھ کا بیٹا تھا جو سکرچاکیا ریاست کا ایک منچلا اور دلیر سردار تھا رنجیت سنگھ سنہ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا - اس کا خاندان سانسی جاٹ ذات کا تھا جس کا قریبی رشتہ سندھن والیوں سے تھا رنجیت سنگھ کی وفات کے وقت سندھن والیہ خاندان دریائے بیاس کے شمال کے تمام سکھ سرداروں میں نہایت زبردست تھا اور اب بھی پنجاب میں سب سے بلند مرتبے پر ہے گو اب اس خاندان میں ممتاز اشخاص موجود نہیں ہیں - دوسرے سکھوں کی طرح سندھن والیہ خاندان بھی راجپوت نسل سے ہونے کا دعی ہے لیکن سانسیوں کی ذلیل اور چور قوم سے بھی اس کا قریبی تعلق ہے اور ان کا آبائی وطن راجہ سانسی جو امرتسر کے ۵ میل کے فاصلے پر ہے اسی نام سے موسوم ہے؛

سکرچاکیا اور سندھن والیہ خاندان کا بانی بدھا سنگھ ایک دلیر لٹیرا تھا - جسے لوٹ مار میں بہت کامیابی حاصل ہوئی تھی - یہ شخص جب اپنی مشہور ابلق گھوڑی دیسی پر سوار ہوتا تو گرد و اطراف کے ملک میں ہل چل مچا دیتا - تقریباً چالیس مرتبہ اسے برچھے - توڑے دار بندوق یا تلوار کے زخم لگے اور بالآخر بستر مرگ پر پڑ کر سنہ ۱۷۱۸ء میں ایک ایماندار شخص کی سی موت مرا - اس کے دو بیٹے چندا سنگھ و نودہ سنگ بھی اپنے باپ کی طرح منچلے تھے - سنہ ۱۷۳۰ء کے قریب انھوں نے سکرچاکیا موضع کی از سر نو تعمیر کی، جو امرتسر کے ضلع میں واقع ہے اور سکھوں کی ایک جانباز سواروں کی جماعت فراہم کر کے اس کے گرد و اطراف وگجرانوالہ میں بہت سے موضعوں پر قبضہ کر لیا چندا سنگھ سے سندھن والیہ سردار پیدا ہوئے - اور رنجیت سنگھ کا مورث اعلیٰ براہ راست نودہ سنگھ تھا - نودہ سنگھ افغانوں سے لڑتا ہوا مجیٹھیہ میں مارا گیا - اس کے بعد صرف ایک لڑکا چرت سنگھ باقی رہا تھا جس کی عمرہ سال کی تھی - یہ آخر میں بہت طاقتور سردار ہوا اور سکرچاکیا مسل کی سرکردگی اپنے

ہاتھ میں لی - سردار جسا سنگھ اہلووالیہ اور بھنگی ریاست کی امداد سے اس نے لاہور کے افغان صوبہ دار عبید خاں کو اس کے مستقر گجرانوالہ سے نکال دیا اور اس کی تمام توپوں اور ساز و سامان پر قبضہ کر لیا - اس نے اہلووالیہ سردار جسا سنگھ کی مدد کی جس پر رام گڑھیا والوں نے حملہ کیا تھا اور اس کا مال لوٹ لیا تھا چنانچہ اس کی مدد سے جسا سنگھ نے رام گڑھیا کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا - جموں کے راجہ رنجیت دیو کے مقابلے پر اس کے فرزند راج دیو کی طرفداری کی غرض سے وہ مہم لیکر گیا لیکن اپنی توڑے دار بندوق کے پھٹنے کی وجہ سے ہلاک ہوا؛

اس کا بڑا بیٹا مہان سنگھ بجائے اس کے ریاست کا فرمانروا ہوا اور اس نے ریاست کے اقتدار و مقبوضات میں بہت کچھ اضافہ کیا جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو ابھی اس کی عمر ۱۱ - ۱۲ سال ہی کی تھی اور اس وجہ سے بڑی مصیبت کا سامنا تھا راجپوت راجہ نے بھنگیوں کے سرغنہ سردار جھنڈا سنگھ کو اپنی مدد کے لیئے طلب کیا تھا - اور اس کے برخلاف کنھیا والے اس کے باغی فرزند کی مدد پر تلے ہوے تھے - چرت سنگھ کی بے وقت موت کی وجہ سے احتمال تھا کہ دشمن کو فتح حاصل ہو جاے لیکن اس کی بیوہ اور سردار جے سنگھ نے جو کنھیا خاندان کا سرغنہ تھا ایک مہتر کو رشوت دیکر جھنڈا سنگھ کو مروا ڈالا - جھنڈا سنگھ پر اس وقت گولی چلائی گئی جبکہ وہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ لشکر میں گھوڑے پر سوار گشت کر رہا تھا - اس کی موت سے اگلے تنازع کا خاتمہ ہو گیا اور دونوں مقابل فوجیں جموں سے واپس چلی گئیں؛

۱۷۷۴ء میں اپنے باپ کی وفات کے ایک سال بعد مہان سنگھ نے جنیدہ کے راجہ گجپت سنگھ کی لڑکی راج کور سے شادی کی - چھ سال کے بعد اس کے بطن سے مہاراجہ رنجیت سنگھ پیدا ہوا - یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس شادی کے بعد ہی فوراً ناچاقیاں پھیل گئیں جو گویا اس بچے کی آیندہ عظیم الشان زندگی کے لیئے پیش خیمہ تھیں - مہان سنگھ ہمراہیوں کے جم غفیر کے ساتھ جنیدہ آیا تھا اور پھلکیان خاندان کے تمام سردار اس سے ملنے کو وہاں جمع ہوئے تھے عین شادی کی تقریب کے موقعے پر جنیدہ اور نابھے کے سرداروں میں باہم تنازع ہو گیا - یہ نزاع ایک گھانس کے رمنے کے متعلق تھی - جو نابھے والوں کی ملک تھا اور اس میں سے براتیوں کو اپنے گھوڑوں کے لیئے

گھانس کاٹنے کی اجازت دی گئی تھی۔ نابھے کے سردار کے کارکن نے براتیوں پر حملہ کیا جس سے لڑائی ہو پڑی جیندہ کے راجہ کو جو لڑکی کا باپ تھا اس معاملے سے اپنی عزت میں بٹہ لگنے کا رنج پہنچا اگرچہ اس نے شادی کی تقریب ختم ہونے تک خاموشی اختیار کی لیکن انتقام کا مضبوط ارادہ کر لیا۔ شادی ختم ہوتے ہی اس نے نابھے کے سردار ہمیر سنگھ کو فریب سے قید کر کے اس کے ملک پر حملہ کیا اور اس کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا چنانچہ اب تک سنگرور کی جائداد پر قبضہ قائم ہے ؛

اس کے بعد کئی سال تک نوجوان مہان سنگھ کے متعلق کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔ ۱۷۸۰ء میں جب کہ غالباً وہ جوان ہو گیا ہوگا اس کا نامور بیٹا پیدا ہو چکا تھا۔ جموں کا راجپوت راجہ فوت ہوا اس کے بعد مہان سنگھ نے اپنی کارروائی ایک مشہور دغا سے شروع کی راجہ برج لال دیو اپنے باپ کا جانشین ہوا اس نے مہان سنگھ سے دوستی پیدا کی اور بھائی چارے کے طور پر پگڑی بدلی۔ اس کی دوستی پر اعتماد کر کے اس نے چاہا کہ بھنگی سرداروں سے اپنا ملک واپس لے۔ اس نے کنھیا والوں کو جن کا وہ باجگزار تھا اپنی مدد کے لئے بلایا۔ پہلے تو ان لوگوں نے منظور کر لیا لیکن پھر فوراً اس کو چھوڑ کے بھنگیوں کی طرف ہو گئے اور ان سے ملکے جموں پر حملہ کرنیکی تجویز کی۔ راجہ نے اپنے نئے رفیق مہان سنگھ سے مدد طلب کی۔ وہ فوراً شمال کی طرف روانہ ہوا اور کنھیا والوں کے لشکر پر دھاوا کر دیا لیکن نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا گیا۔ مہان سنگھ کو اطاعت قبول کرنی پڑی اور راجہ مجبوراً کنھیا سردار حقیقت سنگھ کو پچاس ہزار روپے خراج دینے پر مجبور ہوا۔ چند ماہ کے بعد جب خراج کی رقم بقایا میں پڑ گئی تو حقیقت سنگھ نے مہان سنگھ کو اپنے ساتھ شریک کر کے جموں پر حملہ کرنے پر راضی کر لیا۔ اور یہ قرار پایا کہ مال غنیمت باہم تقسیم کر لیا جائیگا۔ مہان سنگھ نے اس کو منظور کر لیا لیکن وہ دوسرے راستے سے ہو کے پہلے سے جمو پہنچ گیا اور اس نے دیکھا کہ اس میں تنہا حملہ کرنے کی قوت ہے تو اس نے دوستانہ عہد کو فراموش کر دیا اور کنھیا سردار کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اسے بھی بالائے طاق رکھ کر شہر پر دھاوا کر دیا۔ محلات و آبادی میں آگ لگا دی اور حقیقت سنگھ کے آنے سے پہلے ہی مال غنیمت لیکر چلتا ہوا۔ حقیقت سنگھ کا برافروختہ ہونا واجبی تھا لیکن اس میں بدلہ لینے کی سکت نہ تھی اس لئے خاموش ہو رہا۔ اور کچھ عرصے بعد اس کا

انتقال ہوگیا۔ جموں کی بربادی سے کنھیا والوں کی بڑی ریاست اور ان کے سردار جے سنگھ کی آتش غضب مہان سنگھ کے برخلاف بھڑک اٹھی اور انھوں نے اس پر ایسی شدت سے حملہ کیا کہ اسے اپنے ملک کے ایک بڑے قطعے کو کچھ عرصے کے لئے چھوڑ دینا اور معافی مانگنا پڑی۔ اس کی اس درخواست کو اسوقت تک منظور کرنے سے انکار کیا گیا جبتک کہ وہ جموں کی لوٹ کا مال واپس نہ دے لیکن سکرچکیا سردار نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ ایسا نہ کریگا۔ اب اس نے کنھیا والوں کے مقابلے میں دوسرے علاقوں سے اتحاد کیا جس میں رام گڑھیا کا سردار جسا سنگھ جس کا ملک چند سال قبل چھین لیا گیا تھا۔ اور راجہ سنسار چند کانگڑہ کا کٹوچ راجہ شریک تھا۔ ان سب نے متحد ہو کے اتحادی بٹالے کے قریب جو کنھیا والوں کا صدر مقام تھا اُن سے جنگ کی اور بڑے نقصان کے ساتھ انھیں شکست دی۔ یہ واقعہ ۱۷۸۵ء کا ہے۔ سردار جے سنگھ اس نقصان اٹھانے کے بعد پھر نہ پنپ سکا۔ اس نے کچھ کٹوچ راجہ کو کانگڑہ اور جسا سنگھ کو اس کا تمام مقبوضہ ملک واپس کردیا۔ اور مہان سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ کے ساتھ اس نے اپنے بیٹے گربخش سنگھ کی نابالغ بیٹی مہتاب کور کی شادی کردی۔ اس لڑکی کا باپ گربخش سنگھ بٹالے کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔

مہان سنگھ کے مختصر زمانہ حیات کی سازشوں اور مظالم کا ذکر طولانی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ہمسایوں اور حریفوں سے برسر پیکار رہتا خصوصاً بھنگیوں سے گو اس گروہ کے ایک زبردست سردار صاحب سنگھ نے اس کی بہن سے شادی کی تھی۔ اپنے مرنے سے پہلے دو سال تک وہ اپنے بہنوئی سے اکثر لڑتا بھڑتا رہا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صاحب سنگھ کے علاقے سے گجرات کا ایک شہر اس سے چھیننا چاہتا تھا جو خود اس کے مستقر گجرانوالہ سے ۲۰ میل شمال کے جانب واقع تھا۔ صاحب سنگھ کے قلعے سدھران کا محاصرہ کئے ہوئے تھا وہ سخت بیمار ہوگیا۔ کرم سنگھ دولا چنیوٹ کا ایک بھنگی سردار صاحب سنگھ کی مدد کے لیئے فوراً روانہ ہوگیا تھا۔ مہان سنگھ نے فوراً اس پر حملہ کردیا لیکن جنگ کے اثناء میں وہ اپنے ہاتھی پر بے ہوش ہوگیا اور فیلبان اپنے آقا کو یہاں سے واپس لے گیا۔ سردار کی عدم موجودگی کی وجہ سے سکرچکیا فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور محاصرہ اٹھالیا گیا خود مہان سنگھ گجرانوالہ چلا گیا اور یہاں پہنچنے کے

تین دن بعد ۱۷۹۲ء میں صرف ستائیس سال کی عمر میں فوت ہوا؛
اگرچہ باپ کی موت کے وقت رنجیت سنگھ کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی لیکن وہ اپنے باپ کے ساتھ لڑائی پر جایا کرتا تھا اس زمانے میں سکھ لوگ نہایت کم عمری ہی میں فن جنگ سے واقفیت حاصل کیا کرتے تھے سنہ ۱۷۹۰ء میں اس کے باپ نے منچر قلعے کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ قلعہ چھتا جر گے کے ایک مسلمان زبردست سردار غلام محمد کا تھا جس کے ساتھ وہ ہمیشہ برسرپیکار رہتا تھا۔ غلام محمد کا چچا حشمت خاں اس ہاتھی کے اوپر چڑھ گیا جس پر رنجیت سنگھ بیٹھا تھا۔ وہ قریب ہی تھا کہ اُس کا خاتمہ کر دے۔ جس واقعے سے ہندوستان و انگلستان کی تاریخ میں ایک اہم انقلاب واقع ہو جاتا۔ لیکن رنجیت سنگھ کے ایک ساتھی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ باپ کے مرنے کے بعد اگر اس کی ساس سدا کور کا واسطہ نہ ہوتا تو رنجیت سنگھ کے تمام امیدوں کا خون ہو جاتا۔ یہ عورت نہ صرف بڑی قابل تھی بلکہ سردار گربخش سنگھ کی بیوہ اور وارث کی حیثیت سے وہ کنھیا مسل کی سرغنہ بن گئی تھی۔ اس نے پورا ارادہ کر لیا تھا کہ حتی الامکان تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھے اور دونوں ریاستوں کنھیا اور سکرا چاکیا کے افواج کو اپنے تمام حریفوں کے زور توڑنے کے لئے کام میں لائے۔ سب سے پہلے اس نے رام گڑھیا والوں سے بدلہ لینا چاہا جو بٹالے کی لڑائی میں شریک تھے جس میں اس کا شوہر مارا گیا تھا۔ سنہ ۱۷۹۶ء میں اپنی فوج کے ساتھ نوجوان رنجیت سنگھ کی فوج کو شریک کر کے اس نے رام گڑھیا والے سردار جسا سنگھ پر دریائے بیاس کے قریب اس کے قلعہ میانی کا محاصرہ کیا۔ جسا سنگھ نے کچھ عرصے تک تو مدافعت کی لیکن سامان خوراک اور پانی ختم ہو گئے تو امرتسر کے بڑے پجاری صاحب سنگھ بیدی سے امداد کی استدعا کی۔ بیدی نے سدا کور کے پاس پیغام بھیجا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے لیکن سدا کور نے یہ دیکھکر کہ دشمن اس کے قبضے میں آ گیا ہے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا۔ جسا سنگھ نے دوبارہ بڑے پجاری کے پاس پیغام بھیجا جس کے جواب میں پجاری نے کہلا بھیجا کہ وہ لوگ میرا کہنا نہیں مانتے مگر خدا خود تمہاری مدد کریگا۔ اسی شب بیاس میں اس درجے سیلاب آیا کہ کنھیا والوں کے لشکر کے سپاہی۔ گھوڑے اور اونٹوں کی کثیر تعداد اس میں بہ گئی۔ سدا کور

اور رنجیت سنگھ بڑی مشکل سے جانبر ہوئے اور گجرانوالے ہٹ آئے - معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم نے اس نوجوان سردار کی جنگجو طبیعت کو چونکا دیا اور اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اپنی ماں و ساس کی اتالیقی سے آزاد ہو کر خود مختار ہو جائے - اپنی ماں سے تو اس نے فوراً ہی چھٹکارا حاصل کرلیا - یہ عورت نہایت آوارہ تھی - اس کے آشناؤں میں سب سے بڑا دیوان لکھپت رائے تھا جو رنجیت سنگھ کی نابالغی کے زمانے میں ریاست کا منتظم تھا - رنجیت سنگھ نے اس شخص کو ایک خطرناک مہم پر کیتھل روانہ کیا جہاں وہ مارا گیا - بعض کا تو خیال ہے کہ رنجیت سنگھ کے ایما سے ایسا ہوا - اس کی ماں غائب ہو گئی - بعض لوگوں کا بیان ہے کہ خود اس کے بیٹے نے اپنے ہاتھ سے اس کو مار ڈالا اور بعض کا خیال ہے کہ اسے اس کے اشارے سے زہر دے دیا گیا - لیکن یہ روایتیں اس کی طبیعت کی افتاد کے خلاف ہیں - کیونکہ لڑائی کے موقعوں کے سوا دوسرے مواقع پر سختی و جبر کرنا بالکل اس کے مزاج کے خلاف تھا اور اس کو عورتوں کی عصمت و عفت کا کچھ ایسا خیال نہ تھا - مہتاب کور اپنی ناشدنی سازشوں کی وجہ سے غالباً کسی قلعے میں قید کر دی گئی جہاں کچھ عرصے کے بعد وہ مر گئی ؛

رنجیت سنگھ کو اپنی ساس سدا کور سے گلو خلاصی حاصل کرنا ذرا دشوار امر تھا اور ابتداً اس وجہ سے وہ اپنے میں اس کی قوت نہ پاتا تھا اس نے کوئی کوشش اس بارے میں نہیں کی - اس نے رنجیت سنگھ کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ چاہتی تھی کہ لہو لعب و عیاشی میں گرفتار رہے اس کی ترغیب دیتی رہتی تھی - ہندوستان میں نابالغ شہزادوں کے ولی جنھیں اپنا اقتدار قائم رکھنا اور حقوق غصب کرنا مدنظر رہتا ہے عموماً ان کو ایسے مشغلوں میں پھنسا کے ان کی عافیت اور زندگی کو برباد کر دیتے ہیں ؛ آئے دن ماتحت دیسی ریاستوں میں یہی نقشہ نظر آتا ہے اور اس کے نتایج اسی قسم کے ہوتے ہیں - یہ سرکار انگریزی کے عہدہ دار مقامی (رزیڈنٹ) کی ہوشیاری اور جرأت کی سخت آزمایش ہے اور سرکار انگریزی کا صیغہ خارجیہ بعض اوقات بڑی کمزوری سے کام لیتا ہے - رنجیت سنگھ خوش قسمتی سے ایسا ہوشیار تھا اس پر اس قسم کی بدعنوانیوں اور عیاشیوں کا مستقل اثر نہ پڑ سکتا تھا - اس کی جسمانی قوت ایسی تھی کہ عرصے تک ان بے اعتدالیوں کے ضرر سے محفوظ رہا - خاص کارنمائی کا موقعہ اس وقت پیش آیا

جب کہ ہندوستان کے مشہور حملہ آور احمد شاہ کے پوتے شاہ زماں نے اس خیال سے جنوب کے جانب لشکر کشی کی کہ اگر ممکن ہو تو اپنے آبا و اجداد کا ملک جو ہاتھ سے نکل گیا تھا واپس لے۔ ۱۷۹۳ء میں زماں شاہ تیمور کا جانشین ہوا۔ دو سال کے بعد اس نے پنجاب پر حملہ کیا لیکن دریائے جہلم کے آگے جنوب کی سمت نہ بڑھ سکا۔ لیکن ۱۷۹۷ء اور اس کے دوسرے سال اسے زیادہ کامیابی نصیب ہوئی سکھوں نے زیادہ مزاحمت نہ کی اور لاہور پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ سکھوں نے اس موقع پر حسب عادت چالاکی سے میدان مصاف میں جنگ کرنے سے گریز کر کے افغانی سائڈ لشکر کو پریشان کیا اور جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے اُن کو روک کے ساز و سامان لوٹنے لگے۔ بعض سکھ سرداروں نے مصالحت کو مناسب سمجھ کے لاہور جا کر شاہ زماں کی اطاعت قبول کر لی۔ رنجیت سنگھ نے افغانی حملے سے موقع پا کے جنوب ستلج میں لوٹ مار شروع کر دی تھی اظہار اطاعت کے لیئے اپنا ایلچی لاہور روانہ کیا۔ خانگی جھگڑوں کی وجہ سے جب زماں شاہ کو افغانستان واپس جانا پڑا رنجیت سنگھ لاہور کی طرف پلٹا کیونکہ لاہور کے لے لینے کا یہ عمدہ موقعہ تھا۔ دریائے جہلم سیلاب کے وقت عبور کرنے میں افغان بادشاہ کی بارہ توپیں غرق ہو گئیں۔ اُسے چونکہ ان کے نکالنے کی مہلت نہ تھی اس لیئے اس نے رنجیت سنگھ سے جو اس وقت اس قطعۂ ملک کا مالک تھا یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ توپیں برآمد کر کے اس کے پاس بھیجدے تو اسے لاہور کا شہر، ضلع اور راجہ کا خطاب عطا کیا جائیگا۔ رنجیت سنگھ نے بخوشی اس کام کی انجام دہی قبول کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوا۔ منجملہ ۱۲ کے ۸ توپیں اس نے نکلوا کے پشاور بھیجدیں اور زماں خاں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ شاہی خطاب کا عطیہ محض بے سود تھا سکھ سردار کو اپنے قوت و بازو سے قبضہ حاصل کرنا پڑا!!

شہر لاہور تقریباً ۲ ہزار سال سے شاہی دارالسلطنت ہوتا چلا آتا تھا۔ سکھ سرداروں کو ہمیشہ اس پر قبضہ کرنے کی خواہش ہوئی۔ اور اٹھارھویں صدی میں متعدد بار اس پر ان کا قبضہ ہوا اور جاتا رہا۔ ۱۷۶۴ء میں لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے جو دو مشہور شعار بھنگی سردار تھے بالآخر اس پر قبضہ کر لیا۔ ایک اندھیری رات میں یہ لوگ بدرو کے راستے سے اندر داخل ہوئے اور نائب صوبہ دار کو ناچ کی محفل میں

گرفتار کرلیا۔ صبح ہونے تک تمام شہر پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ اس شہر کو انھوں نے تین حصوں پر تقسیم کیا۔ ایک حصہ سردار سوبھا سنگھ کنھیا کو ملا جو اس سازش میں شریک تھا گو وہ عین موقع پر دیر میں پہنچا۔ تین سال بعد احمد شاہ نے جب آخری مرتبہ پنجاب پر چڑھائی کی تو اس نے لاہور کے لیئے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور لہنا سنگھ کا قبضہ بحال رکھا۔ جب رنجیت سنگھ کو لاہور کا شہر عطا ہوا تینوں سرداروں کی اولاد شہر پر قابض تھی۔ لیکن لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے فرزند کمزور اور عیاشی میں سخت مبتلا تھے۔ ان میں سے صرف تیسرے شخص صاحب سنگھ میں کچھ اہلیت تھی لیکن وہ موجود نہ تھا لاہور والے ان لوگوں کی جابرانہ حکومت سے تنگ آگئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے پاس پیغام بھیجا گیا کہ اگر وہ ان سے نجات دلادے تو اُس کی اطاعت بخوشی قبول کی جائیگی۔ چنانچہ رنجیت سنگھ ایک بھاری فوج لیکر روانہ ہوا۔ اس کے پہنچتے ہی شہر کے دروازے کھولدیئے گئے اور دونوں سردار بغیر مقابلہ کیئے فرار ہوگئے۔

۱۷۹۹ء میں لاہور پر اس طرح قبضہ پانے اور راجہ کا خطاب جائز طور پر حاصل کرکے رنجیت سنگھ ۲۰ سال کی عمر میں ایک زبردست سردار بن گیا۔ سکھ امرا اس کی کامیابی سے بہت خائف ہوے اور خاص طور پر بھنگی ان کی راجدھانی پر قبضہ کرنے کی وجہ سے اس سے برسر انتقام ہو گئے۔ ۱۸۰۰ء میں اس کے خلاف ایک جماعت قائم ہوئی جس میں سردار جسا سنگھ رام گڑھیا۔ صاحب سنگھ و گلاب سنگھ بھنگی زیادہ سر برآوردہ تھے۔ قرار یہ پایا کہ بھسین میں ایک مجلس شوریٰ مقرر کی جائے اور وہاں رنجیت سنگھ کا کام تمام کردیا جاے۔ لیکن رنجیت سنگھ ان کے پھندے میں کب پھنسنے والا شخص تھا وہ بھسین جاتے وقت اس قدر کثیر تعداد فوج کی اپنے ہمراہ لے گیا کہ کسی کی ہمت اس کام کے انجام دینے کی نہ پڑی۔ دو مہینے تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد وہ لاہور واپس آگیا۔ لیکن جو سازش بھنگیوں نے اس کے خلاف کی تھی اس سے وہ ناواقف نہ تھا اس نے اسبارے میں خود پیش قدمی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے ان کے صدر مقام امرتسر پر مشہور توپ زمزمہ[۱]

[۱] یہ مشہور توپ جس کے تفصیلی حالات پنجاب کے سردار کے صفحات ۸۸۔ ۲۸۷ میں

کے مطالبے کے لیئے آدمی روانہ کیا جو اس کے دادا چرت سنگھ کو ۱۷۶۴ء میں لاہور کے مال غنیمت سے بطور حصہ دی گئی تھی بھنگیوں نے اس کے دینے سے انکار کیا اور اس بنا پر رنجیت سنگھ نے ان کے قلعۂ امرتسر پر حملہ کر دیا اور انھیں وہاں سے نکال دیا انھوں نے مجبور ہو کے رام گڑھیا والوں کے پاس پناہ لی جن کے ساتھ انھوں نے امرتسر کو تقسیم کر لیا تھا اور ان کے مقبوضات الحاق کر لیئے تھے ؏

اس جرأت و کامیابی کی وجہ سے رنجیت سنگھ سکھوں کے مذہبی و ملکی دونوں صدر مقاموں پر قابض ہو گیا اور اسے اپنے فتوحات کے متعلق آئندہ کوئی اندیشہ نہ رہا کیونکہ کنھیا والوں کی بڑی ریاست بالکلیہ اس کے قبضۂ اختیار میں تھی اور رام گڑھیا کا مشہور سردار جسا سنگھ ضعیف و سن رسیدہ ہو چکا تھا اور رنجیت سنگھ جانتا تھا کہ اس کی جاگیر پر قبضہ حاصل کرنے کے لیئے زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑیگا۔ سال آئندہ اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا جودھ سنگھ گو بہادر سپاہی تھا لیکن نہایت سادہ مزاج تھا اور مہاراجہ کا (کیونکہ اب رنجیت سنگھ کو مہاراجہ کہنا بجا تھا) وفادار ہو گیا تھا۔ ایسی حالت میں ریاست کو بہ جبر لینا غیر ضروری شرارت تھی۔ جودھ سنگھ نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ہمیشہ رفاقت کرنے کی قسم کھائی اور رنجیت سنگھ ہر طرح اس کی خوشامد و دلجوئی کرنے لگا۔ رام گڑھیا کے قلعے کے طرز پر امرتسر میں اس کے لیئے نیا قلعہ تعمیر کیا گیا جودھ سنگھ رنجیت سنگھ کے ساتھ مہمات میں اکثر شریک ہوا۔ ۱۸۱۶ء میں جودھ سنگھ کا انتقال ہوا اور اس کے بعد اس کا جانشین رنجیت سنگھ سے برسر پرخاش ہوا رنجیت سنگھ نے قلعے پر قبضہ حاصل کر کے اسے مسمار کر دیا اور تقریباً ایک سو اور چھوٹے چھوٹے قلعے شکست کر دیئے اور اس ریاست کے مقبوضات جو امرتسر۔ جالندھر و گرداسپور میں تھے الحاق کر لیئے۔ مفتوحہ خاندانوں کے سرگروہوں کو اس نے اچھی اچھی جاگیریں دیں اور فوج میں یا اپنے پاس معزز عہدے عطا کیئے ؏

۱۸۱۰ء میں نکائی ریاست کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ یاد ہو گا کہ رنجیت سنگھ نے

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ بیان کیئے گئے ہیں احمد شاہ نے ۱۷۶۱ء میں لاہور میں ڈھلوائی تھی۔ اب یہ توپ لاہور کے عجائب خانے کے روبرو رکھی ہوئی ہے ؏

سنہ ۱۸۰۲ء میں ایک نکائی لڑکی سے شادی کی تھی اور صرف اسی کے بطن سے رنجیت سنگھ کی اولاد پیدا ہوئی تھی ۔ لیکن اس شادی سے رشتہ داروں میں اچھے تعلقات قائم نہ ہوئے ۔ سنہ ۱۸۰۷ء میں جب کانھ سنگھ راج کور رانی کا بھتیجا خاندان کا رئیس ہوا تو مہاراجہ نے اُسے دربار میں آکر رہنے کی ترغیب دی لیکن کانھ سنگھ جانتا تھا کہ ایک دفعہ آنے کے بعد پھر چھٹکارا محال ہے ۔ مرغِ اسیر کو گرفتار ہونیکے بعد پھر رہائی نصیب نہیں ہوتی ۔ اس لیئے اس نے سخت انکار کردیا ۔ مگر اس انکار پر بھی اس کا پیچھا نہ چھوٹا کیونکہ مہاراجہ نے اس کی تمام جاگیر جو قصور، چونیاں اور گوگیرا میں لاہور سے اس قدر قریب واقع تھیں کہ اُس کا بچانا بالکل ناممکن تھا الحاق کرلیں ۔ مہاراجہ کے طریق عمل کی یہ عمدہ مثال ہے ۔ اس بات کے لیئے کوئی حیلہ اس کے پاس موجود نہ تھا اور کانھ سنگھ جو قریبی رشتہ دار تھا سوائے اس کے کہ ان کے بچانے کی طاقت نہ رکھتا تھا کوئی قصور نہیں کیا تھا؛

سب سے آخری بڑی ریاست جو مہاراجہ کے دست تصرف میں آئی وہ کنھیا کی تھی جس کی رئیسہ اس کی ساس سدا کور تھی ۔ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ اس عورت نے شیر سنگھ اور تارا سنگھ دو لڑکے اس کے روبرو یہ کہکر پیش کیئے کہ وہ مہتاب کور کے بطن سے اس کی اولاد ہیں ۔ اس فریب کو جس کے اسباب باب آئندہ میں بیان کیئے جائینگے مہاراجہ نے ملکی مصالح کے لحاظ سے درست مان لیا تھا لیکن اس امر کا مصمم ارادہ کرلیا کہ اس کا بدلہ مناسب موقع پر لیا جائے ۔ یہ موقع اس وقت تک حاصل نہ ہوا جب تک کہ شیر سنگھ کی عمر ۱۲ سال کی نہ ہوئی اور ہزارے میں برائے نام فوج کی سرکردگی پر اسے روانہ نہیں کیا گیا ۔ اس مہم میں بہادر سردار دیوان رام دیال یوسف زئیوں کے ہاتھ گندگڑھ میں مارا گیا ۔ اس موقع پر شیر سنگھ نے بہت عمدگی سے کام انجام دیا اور اس کے واپس آنے پر مہاراجہ نے مائی سدا کور پر جس نے شیر سنگھ کو اپنا متبنّیٰ بنالیا تھا یہ مشورہ دیا کہ اب اس کا وقت ہے وہ دنیاوی امور سے بطور مناسب کنارہ کش ہوکے اپنے نواسے کو ریاست کا کام تفویض کردے ؛

بڈھی رانی ترک ریاست کے لیئے آمادہ نہ تھی لیکن وہ لاہور سے چند میل کے فاصلے پر شاہدرے کے مقام پر مقیم تھی اور یہ ظاہر تھا کہ اب انکار سے خراب نتائج پیدا ہونگے

اندیشہ ہے اس لیئے اس نے لیت ولعل شروع کیا اور اپنے صدر مقام بٹالے واپس جا کر اس نے انگریزوں سے نامہ وپیغام شروع کیا اور ان سے التجا کی کہ اسے ان کے زیر حفاظت ستلج اس پار کے ملک میں سکونت کرنے کی اجازت دیجائے۔ مہاراجہ کو بھی اس پیغام بھیجنے کا حال معلوم ہو گیا اور اس نے سدا کور کو اپنے سامنے طلب کر کے اپنے سابق حکم کا ڈرا دھمکا کر اعادہ کیا۔ مائی سدا کور اسی شب میانے میں سوار ہو کر فرار ہو گئی لیکن رنجیت سنگھ کے سپاہیوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا اور اسے ایک قلعے میں محبوس کر دیا گیا جہاں کچھ عرصے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اور مہاراجہ نے اس کی تمام بڑی بڑی جاگیروں کو بلا کسی مزاحمت کے ملحق کر لیا اب صرف اٹلگڈھ اور رکیری کے قلعوں پر مدافعت رہ گئی۔ اٹال گڑھ کے قلعے میں سدا کور کی ساتھی ایک عورت نے مقابلہ کیا اور رکیری پر دیوان فتح چند کو جو اس کی تسخیر کے لیئے روانہ کیا گیا تھا بہت دقتیں پیش آئیں۔ بٹالہ شیر سنگھ کو جاگیر میں دیدیا گیا اور یہ چالاک عورت جس نے یہ جھوٹا شہزادہ بنا کے کنواں دوسروں کے لیئے کھودا تھا خود اسی میں گر گئی۔ یہ امر بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ گو سدا کور سے ہیر اور قصور ہوئے ہوں لیکن مہاراجہ کے ساتھ اُس نے نیکی کی تھی لیکن مہاراجہ نے اس کے ساتھ نہایت ناشکری کا سلوک کیا۔ اس کے روپے اور فوج سے مہاراجہ کو لاہور و امرتسر پر قبضہ نصیب ہوا اور باپ کے مرنے کے بعد جو کشمکش کی حالت تھی اس سے اسی کے بدولت اسے نجات حاصل ہوئی ؎

باب نہم

انگریز اور ستلج اس پار کا قطعۂ ملک

مہاراجہ صرف ایک دوستی میں ثابت قدم رہا اور اسی ایک اتحاد سے اس نے کبھی گریز نہیں کیا۔ یہ دوستانہ اتحاد انگریزی سلطنت کے ساتھ تھا۔ جس کی نمایندہ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔ اس صدی کے اوایل میں جب تک وہ انگریزوں کی مصلحت واقتدار سے پورا پورا واقف نہ تھا وہ اس ششں وپنج میں رہا کہ ان پردیسیوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کیا جائے اور ۱۸۰۸ء میں تو اس نے تقریباً جنگ کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن جب ۱۸۰۹ء کے معاہدے کے مطابق ان کی اور خود اس کی حیثیت کا ایک مرتبہ تصفیہ اور تصدیق ہو گئی جس کی رو سے اس نے ستلج اس پار کے تمام سرداروں پر سے اپنا اقتدار اٹھا لیا تو اس نے ان فرائض وذمہ داریوں کو خوشی سے قبول کر لیا جو اس معاہدے کی رو سے اس پر عاید ہوئی تھیں اور ۳۰ سال تک سرکار انگریزی کا سچا وفادار رفیق بنا رہا۔ اس نے حکومت انگریزی کے وعدوں پر ایسا پورا پورا اعتماد کیا جس کا ایسے شکی اور بے باک فرماں روا سے تعجب ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی ملکی مصلحت بینی کا یہ بہترین ثبوت ہے۔ مہاراجہ کا اعتبار انگریزی حکومت سے بیجا نہ تھا۔ حکومت انگریزی نے بھی ہمیشہ رنجیت سنگھ کے ساتھ آزادانہ اور دوستانہ برتاؤ کیا کیونکہ سرکار انگریزی یہ سمجھتی تھی کہ اس وقت کے غیر منتظم صوبے اور شمالی مغربی سرحد کے دروں کی غیر معلوم طاقت کے مابین یہ شخص روک تھام کا کام دیگا۔ جہاں سے ہندوستان کے میدانوں میں حملہ آور افواج کا ہمیشہ سیلاب جاری رہا ہے اسی وجہ سے کبھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ لاہور کی ریاست خود اپنی اندرونی خرابیوں کی وجہ سے معرض زوال میں آئی نہ کہ سرکار انگریزی نے اس کے مخالف کوئی منصوبہ نہیں کیا تھا؛

ہندوستان کی تاریخ میں ہماری حکومت کی ابتدا اور اس کا ستلج اس پار کی

ریاستوں اور مہاراجہ سے تعلق پیدا کرنے کا باب بہت سبق آموز ہے۔ لیکن وہ اس قدر طولانی ہے کہ اس کا اعادہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق مرہٹوں کے اور ان کی تربیت یافتہ فوج سے ہے جو فرانسیسی جنرلوں کے زیر کمان رہیں نیز جارج طامس کے حیرت انگیز واقعات زندگی سے جو ایک انگریز تھا اور جس نے بڑی جرأت و بہادری سے شمالی ہند میں ایک سلطنت کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس میں اسے کامیابی ہوتے ہوتے رہ گئی ان واقعات کا صرف سرسری طور پر بیان کیا جا سکتا ہے[1]۔

اس صدی کے اوایل میں سرکار انگریزی کی قوت ہندوستان میں سیلاب کی طرح جلد جلد بڑھ رہی تھی۔ نقشے میں جس سرخ لکیر سے اس کی حد بندی کی گئی تھی۔ اس میں روز بروز وسعت ہو رہی تھی اور خود رنجیت سنگھ نے اس امر کی بالکل صحیح پیشین گوئی کی تھی کہ ایک دن تمام ہندوستان سرخ ہو جائیگا۔ بنگال۔ بنارس۔ اودھ۔ الہ آباد۔ کانپور۔ فرخ آباد یکے بعد دیگرے مطیع ہو چکے تھے کہ ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک نے مرہٹوں کی فوج کو جو بورقین کی سرکردگی میں تھی دہلی کی فصیل کے نیچے شکست دی اور اس کے چار دن بعد ہندوستان کے دار السلطنت میں بہ حیثیت فاتح داخل ہوا یکم نومبر کو لسواری کی جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کو دوبارہ نقصان عظیم کے ساتھ شکست ہوئی اور سندھیا نے سرجی انجن گاوں کے معاہدے کی رو سے سرسہ۔ حصار۔ رہتک دہلی۔ گرگاوں اور آگرہ سرکار انگریزی کے حوالے کر دئیے۔ لیکن ان میں سے پہلے تین اضلاع پر ۱۸۰۸ء تک سرکار انگریزی نے اپنا عمل دخل نہیں کیا۔

ستلج اس پار کے سرداروں نے مرہٹوں سے دوستی کر لی تھی اور جنرل بورکین نے کیونکہ ان کے دشمن جارج تامس کو ابھی شکست دے دی تھی انھوں نے انگریزوں سے دہلی میں جنگ کی۔ مگر انھوں نے ہماری طاقت کا غلط اندازہ کیا تھا۔

---

[1] ان واقعات کے تاریخی حالات کی تصریح "پنجاب کے راجاؤں" کی اشاعت دوم صفحہ ۸۳-۱۳۰ میں کی گئی ہے۔

۱۸۰۴ء میں برابر سال بھر تک جمنا کے آس پاس انگریزوں کو بہت پریشان کیا اور دہلی کی فصیل تک ملک میں لوٹ مار مچاتے رہے لیکن کرنل برن نے جب ۱۰ ڈسمبر ۱۸۰۴ء کو انھیں سخت شکست دی تو انھوں نے دریا پار جاکر دم لینا غنیمت سمجھا اور ان کے دو سربرآوردہ سردار جنیدھ کا راجہ بھاگ سنگھ اور کیتھال کا راجہ بھائی لال سنگھ انگریزی فوج سے جا ملے اور ہمیشہ کے لیئے ان کے رفیق ہو گئے؛

اکتوبر ۱۸۰۴ء کو جسونت راؤ ہلکر نے جس نے کرنل مانسن کی بریگیڈ پر فتح عظیم حاصل کی تھی فوج کثیر سے دہلی کا محاصرہ کیا لیکن کرنل اختر لونی اور کرنل برن نے اسے پسپا کر دیا۔ دو مہینے بعد فتح گڈھ اور دیگ پر جنرل لیگ و جنرل فریزر نے سخت قتل وخوں ریزی کے بعد مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ ان کا سردار ہلکر بے فوج رہ گیا۔ کچھ عرصے تک تو وہ اس فضول کوشش میں رہا کہ ستلج کے جنوب میں پھر فوج جمع کرے لیکن بعد میں وہ شمال کے جانب سکھوں سے امداد لینے کے لیئے چلا گیا جن کی امداد اگرچہ سندھیا کی امداد کے مقابلے میں زیادہ کارگر نہ تھی لیکن اس سے زیادہ قابل اعتماد تھی۔ سندھیا بظاہر تو اظہار دوستی پر مجبور تھا لیکن دل میں ہلکر سے سخت متنفر تھا۔ ہلکر کئی مہینے تک پٹیالے میں رہا لیکن پٹیالے کے مہاراجہ نے اس کی مدد کرکے خود نقصان اٹھانا گوارا نہ کیا اور ستلج اس پار کے دوسرے سرداروں نے بھی یہ دیکھکر کہ اس کی کامیابی کی امید نہیں ویسی ہی دانشمندی اختیار کی۔ بالآخر ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک اور ہلکر سے دوبارہ سرمیدان جنگ کی ٹھہری تو وہ امرتسر بھاگ گیا اور رنجیت سنگھ کو ملانے کی کوشش کی۔ رنجیت سنگھ بھی اس کی امداد پر بہت کچھ آمادہ ہو گیا تھا لیکن اس کے مشیر فتح سنگھ اہلوو الیہ اور جنیدھ کے راجہ نے اسے باز رکھا ورنہ فوراً انگریزوں سے اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی۔ لارڈ لیک نے بیاس تک ہلکر کا پیچھا کیا اور اگر گورنر جنرل کو اس کی دھن نہ ہوتی کہ جس قدر جلد ہو سکے صلح کر لی جائے تو ہندوستان میں انگریزوں کے سخت ترین دشمن کا بالکل خاتمہ ہو جاتا۔ مگر اس وقت لندن کی مجلس نظما کو پھر بزدلی کی ہوک اٹھی ہوئی تھی۔ لارڈ ویلزلی کو جو گورنر جنرلوں میں سب سے زیادہ سربرآوردہ تھا بے باک حکمت عملی سے خائف ہوکر کارنوالس سا کمزور شخص ان کارروائیوں سے پلٹ دینے کے لیئے بھیجا گیا؛

حماقت سے باہمی آشتی کو بڑی دانشمندی تصور کیا گیا۔ ہلکر کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے اسے اس قطعۂ ملک کا حصۂ کثیر واپس دیدیا گیا جو اس سے قبل چھین لیا گیا تھا۔ یکم جنوری ۱۸۰۶ء کو ایک ضمنی معاہدہ رنجیت سنگھ اور اہلو والیہ سردار کے ساتھ کیا گیا۔ یہ معاہدہ گویا آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرداران رنجیت سنگھ و فتح سنگھ کے مابین اتحاد و دوستی قائم کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا جس کی رو سے رنجیت سنگھ جسونت راؤ ہلکر کو فوراً امرتسر سے باہر بھیجدینے اور آئندہ کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے یا فوج یا کسی اور طریقے سے اس کی امداد نہ کرنے کا اقرار کیا۔ سرکار انگریزی نے اس کے معاوضے میں وعدہ کیا کہ جبتک یہ سردار سرکار انگریزی کے دشمنوں سے کسی قسم کا دوستانہ تعلق نہ رکھینگے یا سرکار انگریزی کے خلاف مخاصمانہ برتاؤ کرنے سے محترز رہینگے اس وقت تک نہ انگریزی فوج ان کے ملک میں داخل ہوگی اور نہ سرکاران کے ملک یا مقبوضات کو ان سے لینے یا انھیں بیدخل کرنے کی کوئی کارروائی کرے گی؛

یہ معاہدے جن سے ہلکر پنجاب سے خارج ہوا رنجیت سنگھ کو عملاً انگریزوں کی دست اندازی سے نجات ہوئی کہ وہ اپنے منصوبے شمالی ستلج میں فتوحات کرنے کے لئے کام میں لائے۔ اس دریا کے جنوب کا قطعۂ ملک جو سکھ سرداروں کے قبضے میں تھا اس وقت معرض بحث میں نہ آیا تھا۔ ۱۸۰۶ء کے موسم گرما میں پھلکیان راجاؤں کے باہمی تنازعہ نے رنجیت سنگھ کو حملہ کرنے پر آمادہ کردیا۔ اس بدنصیب علاقے کی حالت بے حد قابل تاسف تھی۔ سکھ ریاستوں اور دہلی کے مابین کے اضلاع کی حالت جنھیں انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں حاصل کیا تھا شاید بہت قابل رحم ہو رہی تھی لیکن اس قطعۂ ملک کے اس حصے کے مزارعین کی حالت بھی جو سکھوں کے حدود میں تھے ویسی ہی خراب تھی۔ مسٹر ڈینزل ایبٹسن نے کرنال کی رپورٹ بندوبست اراضی میں تحریر کیا ہے کہ :-

"اس طرح ۱۸۰۵ء میں اس ہولناک زمانے کا خاتمہ ہوا جس کو لوگ عموماً سکھاشاہی یا مرہٹوں کے زمانے کی بدعلی کہتے ہیں۔ ابتک دیہاتوں کے دلوں میں اسکی یاد تازہ ہے۔ درحقیقت کبھی پانی پت کے جنوبی قطعۂ ملک پر سکھوں کا قبضہ قائم نہ رہا۔

اور اس علاقے میں جو کچھ ان کے مقبوضات تھے وہ مرہٹوں کے باجگزار کی حیثیت سے تھے۔ لیکن یہ تمام زمانہ ان دونوں قوموں کے باہمی تنازعات میں گزرا اور یہ قطعۂ ملک دونوں کے مقبوضات کے مابین ایک لاوارث ملک تھی۔ دونوں اس کو لینا چاہتے تھے مگر حفاظت کا ذمہ کوئی نہ لیتا تھا۔ یہ قطعہ درحقیقت اُس کا شکار رہتا جو اس وقت سب سے زیادہ قوی اور دلیر اور لٹیرا ہوتا۔ ۱۸۰۶ء میں بھی نادر شاہ کو دوآب کے راستے سے دہلی جانا پڑا تھا کیونکہ مرہٹہ فوجوں کی ہمیشہ آمد و رفت کی وجہ سے یہ قطعہ اس درجہ ویران ہو گیا تھا کہ یہاں رسد کا ملنا ناممکن تھا۔ اور چالیس سال بعد جب ہم نے اس ضلع کو اپنے قبضے میں لیا تو یہ اندازہ کیا گیا کہ اس قطعۂ ملک کا ⅔ حصہ جنگل ہو گیا تھا اور یہاں کے باشندوں کا استیصال کر دیا گیا یا جلاوطن ہو گئے۔ شاہی نہر مدت سے خشک پڑی ہوئی تھی اور زراعت کی جگہ گھنے جنگل ہو گئے جو لٹیروں خانہ بدوشوں اور درندوں کا مامن تھا۔ ۱۸۲۷ء میں مسٹر آرچر نے یہ بیان کیا کہ چند سال قبل تک تمام ملک وحشی جانوروں سے بھرا ہوا تھا شارع عام کے آس پاس ویران کھنڈر اب تک اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ لوگوں کو ان مستحکم سے مستحکم مواضعات کو بھی ترک کرنا پڑا جہاں ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے آباد تھے وہ ان کو چھوڑ کر ایسے مقامات پر آباد ہونے کے لیئے مجبور ہوئے جو قزاقوں کے دستبرد سے کسی قدر محفوظ تھے۔ تحصیل لگان کا اس وقت کوئی انتظام نہ تھا۔ کاشتکاروں کی حالت یہ تھی کہ تلوار ہاتھ میں لیئے ہل چلایا کرتے تھے۔ محصول وصول کرنے والا اپنے ساتھ فوج لیکر لگان وصول کرنے آیا کرتا تھا اور اگر وہ اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو اس کے پیچھے دوسرا فوراً موجود ہوتا تھا تاکہ بچی کھچی رقم کو وصول کر کے چلتا ہو۔"

رنجیت سنگھ اپنے چچا جیندہ کے راجہ بھاگ سنگھ کے بلانے سے ۲۶ جولائی ۱۸۰۶ء کو کثیر لشکر کے ساتھ ستلج عبور کر کے بھاگ سنگھ اور مہاراجہ پٹیالہ کے باہمی تنازع کے تصفیے کے لیئے گیا۔ انگریزوں کو اس کی آمد سے یک گونہ انتشار رہا اور انھوں نے کرنال میں اپنی فوجی قوت مستحکم کر لی لیکن رنجیت سنگھ ایسا بے احتیاط نہ تھا کہ انھیں چھیڑتا۔ وہ صرف لدھیانے اور گھونگرانے کے اضلاع پر قبضہ کر کے قانع ہو گیا

جس کو اس نے اپنے دوستوں پر تقسیم کر دیا لدھیانے کا خاندان قدیم راجپوت مسلمانوں کا تھا اور اس وقت دو بیوائیں اس کی پس ماندہ تھیں رنجیت سنگھ نے سخت بے حیائی سے اُن کے تمام مقبوضات کو لوٹ لیا۔

دوسرے سال اسی موسم میں وہ پٹیالے پھر آیا۔ اس مرتبہ ایک کثیر تعداد فوج کی دیوان مکھم چند کے زیر کمان اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے راجہ صاحب سنگھ اور اس کی بیوی مشہور رانی آس کور کے درمیان صفائی کرادی جس سے دوسرے فریق کو جس نے بہت سی رشوت دی تھی بہت کچھ فائدہ ہوا۔ اب کی واپسی میں اُس نے بہت سی جائدادیں مثلاً نارائن گڑھ۔ ودنی۔ مزنڈا۔ زیرا وغیرہ جو زیادہ تر فیروز پور کے ضلع میں واقع تھیں چھین لیں اور انھیں اپنے متوسلوں پر تقسیم کر دیا۔

ستلج اس پار کے سردار اب سمجھ گئے کہ آپس کے جھگڑوں میں دخل دینے کے لیئے رنجیت سنگھ کو بلا کے خود ایک ایسا دیو پیدا کر لیا ہے جو اُن کے قابو میں نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے مارچ ۱۸۰۸ء میں جھندکا راجہ کیتھل کا بھائی لال سنگھ جو ایک سربرآوردہ سردار تھا پٹیالے کے راجہ صاحب سنگھ کے نایب کو ساتھ دہلی لے گیا کہ سرکار انگریزی کے رزیڈنٹ مسٹر سیٹن سے ملکے اور دریافت کرے کہ آیا سرکار انگریزی ان کو اپنی حفاظت میں لینے پر آمادہ ہے یا نہیں۔ سرکار انگریزی چاہتی تھی کہ ایسا ہی سمجھا جاے لیکن اس امر کا پس وپیش تھا کہ سب سے بہتر طریقہ اس کو انجام دینے کا کیا ہو۔ حکام انگریزی چاہتے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملک گیری کا حوصلہ ستلج کے شمالی جانب تک محدود رہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ رنجیت سنگھ کا مصمم قصد ہے کہ دریا کے شمال وجنوب دونوں طرف کے سکھوں پر اپنا اقتدار قائم رکھے اور اس لیئے اسے یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ اس طرح یکبارگی مداخلت کرنے سے کہیں دوستانہ تعلقات میں رخنہ نہ پڑے اور وہ فرانسیسیوں کے ہتے چڑھ جائے۔ گو اس وقت جبکہ فرانس کے مقبوضات ہند صرف دو یا تین معمولی بستیوں پر محدود ہیں یہ امر تعجب خیز معلوم ہو لیکن صدی کے اوایل میں حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔

انگریزوں و فرانسیسیوں کے مابین رقابت چلی آرہی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے جو ور رہے اسی کو دنیا میں تجارتی و ملکی اقتدار حاصل ہو۔ ہندوستان

میں بھی یہ مخالفت ایسی شد و مد سے ہوتی رہی جس طرح دوسرے ممالک میں اور بالآخر اس کا خاتمہ ۱۷۸۳ء میں ورسیلیس کے معاہدے سے ہوا۔ اس وقت سے ہندوستانی علاقے میں انگریزوں سے دشمنی و نفرت کی روایتوں کو فرانسیسیوں کے قابل جرنل بڑھاتے رہے مثلاً کامٹی ڈی بوائی۔ پیرن اور بورقین نے مرہٹوں کے خانہ بدوش جرگوں کو اسی طرح ترتیب دے کر آراستہ فوج بنا دیا جس طرح ونٹورا۔ ایلرڈ اور کورٹ نے ۴۰ سال کے بعد خالصے کی فوج کو مرتب کیا۔ اس کے بعد فرانسیسی بادشاہوں کے غصب اور جمہوریت کے غیظ سے بدرجہا زیادہ نپولین کی فراست و اولوالعزمی سے ایشیا و یورپ کے مطلعے بادل سے گھرے ہوئے تھے۔ مرینجو آسٹرلیٹز بینا کی توپوں کی گونج طہران و لاہور تک پہنچی اور ایشیا میں کوئی دربار ایسا نہ تھا جہاں اس عظیم الشان فاتح کے حالات کا بڑے شوق سے تجسس نہ ہو جس کی کامیابی ویسی ہی سریع و یقینی تھی جیسی سکندر اعظم و تیمور کی؛

اور سرکار انگریزی کا تردد کچھ بیجا بھی نہ تھا۔ نپولین کی اولوالعزمی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک وقت تو اس نے یہ ارادہ ہی کر لیا تھا کہ ہندوستان میں فرانسیسی شاہنشاہی کی تجویز کو پھر عمل میں لائے جو اس سے قبل مشہور ڈوپلے کے زمانے ہی میں قائم ہو چکی ہوتی اگر اس کا احسان فراموش ملک بجائے تائید دینے کے اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کرتا۔ ۱۸۰۸ء میں اس خواب کی تعبیر کے پورا ہونے کا وقت گزر چکا تھا اور نپولین کا یہ ارادہ کہ ایران کو محفوظ مرکز قرار دیکے کابل و لاہور کو یکے بعد دیگرے تسخیر کرے اُس کی قوت کے باہر تھا۔ لیکن اس کے ارادے کی اطلاع یابی نے انگریزوں کو بے چین کر دیا اور اس کے توڑ کے لیئے مسٹر الفنسٹن کو کابل اور مسٹر سی۔ ٹی مٹکاف کو رنجیت سنگھ کے دربار میں معاہدات کرنے کے لیئے روانہ کیا گیا؛

مہاراجہ بڑا ہوشیار تھا۔ وہ انگریزوں کی اس سراسیمگی سے آگاہ تو ہو گیا لیکن اُس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتا تھا۔ انگریز اس کے ستلج اس پار کے ملک پر حملہ کرنے کی وجہ سے اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ شمال کی جانب سے افغانوں کے حملہ کرنے کا خدشہ ہر وقت لگا ہوا تھا۔ پنجاب خاص کے سکھ امرا اپنی ہٹ پر قائم تھے اور

اور اس کی جانب سے ان کے دلوں میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ جن لوگوں کو اس نے مغلوب کیا تھا وہ بدلہ لینے کے لیئے بے چین تھے اور جن پر اب تک اس نے حملہ نہیں کیا تھا وہ اس کی دغا بازی اور ظلم سے ترساں تھے۔ اسی کے ساتھ اس کی یہ تجویز کہ ستلج اس پار کی تمام ریاستوں کو وہ اپنا محکوم بنا کر ایک بڑی سلطنت قائم کرلے جس میں خالصے کے تمام سپوت شامل ہوں ہمیشہ اس کے پیش نظر تھی اور اس کی تکمیل کی معقول امید بھی اُس کو تھی۔ اس کے ستلج اس پار کے تین مہمات نے اس پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ پھلکیان کے راجہ اور مالوے کے سردار کس درجہ کمزور ہیں اور ان میں باہم اس درجہ نفاق ہے کہ اس کے مقابلے میں وہ متحد نہیں ہو سکتے اور ادھر انگریزوں نے اس وقت تک براہ راست کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ دہلی جا کر جن لوگوں نے حفاظت طلب کی تھی انھیں بھی بلطایف الحیل ٹال دیا گیا تھا۔ انگریزی سفرا کے وسط ماہ اگست میں کرنال سے روانہ ہو کر وہاں آنے کی خبر نے رنجیت سنگھ کو گونہ متردد کر دیا لیکن شرایط کے طے ہونے سے قبل اس نے اپنی حالت کو مستحکم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ستلج اس پار کے حملے کی تیاری کے لیئے اس نے قصور میں فوج کشی شروع کر دی۔ مسٹر مٹکاف ۱۱ ستمبر کو پٹیالے ہوتا ہوا وہاں پہنچا۔ پٹیالے پہنچنے پر راجہ نے دوبارہ حفاظت کی استدعا کی اور اس قدر ترغیب قرینے کی سعی کی کہ وہ شہر کی کنجیاں اس کے حوالے کر دینا چاہتا تھا تاکہ اور وہ سرکار انگریزی کی طرف سے پھر اسے واپس کر دے ؛؛

مسٹر مٹکاف نے بلا کسی پس وپیش مہاراجہ کے روبرو ان تجاویز کو پیش کیا جن کے لیئے سرکار کی جانب سے وہ روانہ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں مدافعانہ اور جارحانہ صورتوں میں معاہدہ کیا جائے۔ کیونکہ حملہ ہونے کی صورت میں سرکار انگریزی اور ریاست لاہور دونوں کا مدافعت میں فائدہ تھا۔ مہاراجہ نے بخوشی خاطر اس تجویز کو قبول کر لیا لیکن اس کے معاوضے میں اس نے یہ چاہا کہ تمام سکھ ریاستوں اور سکھ قوم پر اس کی حکومت تسلیم کی جائے مسٹر مٹکاف اس کے ادعا کے قبول کرنے کا مجاز نہ تھا اور چونکہ اس نے کلکتے سے استمزاج کی صورت میں بھی کامیابی کی توقع ظاہر نہیں کی اس لیئے رنجیت سنگھ اس مقام سے

کوچ کر کے ستلج کے اُس پار چلا گیا۔ سفیر اگرچہ اس بد خلقی سے ناخوش ہوا لیکن اسے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ بھی روانہ ہو جائے۔ کھئی سے فرید کوٹ جانا ہوا اور یہاں زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔ فرید کوٹ سے مالیر کوٹلہ پہنچ کر خراج کی وافر رقم طلب کی گئی۔ مسٹر مٹکاف مہاراجہ کے لشکر کے ساتھ ساتھ رہا۔ سفیر صرف اس وقت اس سے علیحدہ ہوا جبکہ مہاراجہ نے انبالے جانے کی تجویز کی جو ان ریاستوں کے عین قلب میں واقع تھا جنھوں نے سرکار انگریزی سے حفاظت کی استدعا کی تھی۔ یہاں سے علیحدہ ہو کر سفیر فتح آباد روانہ ہو گیا۔ مٹکاف نے جو مسودہ معاہدے کا رنجیت سنگھ کے روبرو پیش کیا تھا وہ صرف فرانسیسیوں کے مقابلے میں اتحاد کرنے کے متعلق تھا۔ بخلاف اس کے رنجیت سنگھ نے جو مطالبہ کیا تھا وہ صرف یہ نہ تھا کہ انگلستان کے ساتھ قطعی اتحاد ہو جائے اُس سے اور کابل سے تنازع ہو تو کسی قسم کی مداخلت نہ ہو اور ستلج کے شمال و جنوب کے سکھ ممالک میں اس کی بلاشرکت غیرے حکومت تسلیم کر لی جائے۔

مہاراجہ کی پالیسی دانشمندانہ اور جری تھی اور وہ اُس قسم کی کامیابی کا مستحق تھا جو اُس کو غالباً حاصل ہو جاتی خواہ فرانسیسی حملے کا اندیشہ واقعی ہوتا نہ کہ محض خیالی۔ اسے فرانس کی پروا نہ تھی اور وہ یہ جانتا تھا کہ نپولین اس کا دشمن نہیں ہے بلکہ انگریزوں کا حریف ہے۔ اگر انگریز فرانسیسیوں کے خلاف اسے اپنا شریک کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کا معاوضہ دینا چاہیئے اس لیئے اس نے اپنے مطالبات سفیر اور گورنر جنرل کے روبرو باصرار تمام پیش کیئے۔ معاہدے کے دوران تصفیہ میں ستلج اس پار کا جس قدر حصہ اسے مل سکا اس پر اس نے بجبر قبضہ کر لیا تاکہ معاہدے کے تصفیے پر خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو جو ملک اس کے تصرف میں آجائے اس پر قبضہ بحال رہے اس نے بڑی دانشمندی سے سفیر کو اپنے لشکر میں روکے رکھا تاکہ سرداروں کی مزاحمت قوت نہ پکڑ سکے اور اس کی کارروائی ایک طور سے سرکاری منظور شدہ تسلیم کی جائے۔

مسٹر مٹکاف کے لشکر سے چلے جانے کے بعد مہاراجہ نے فتح ممالک کا سلسلہ جاری رکھا اس نے شاہ آباد اور انبالے پر قبضہ کر لیا اور پٹیالے کو بھی اپنے

دست تصرف میں لے آتا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اس کارروائی سے صریحاً انگریزوں کے ساتھ نقض عہد ہوگا اس لیئے اس نے صرف اس امر پر اکتفا کیا کہ راجہ صاحب سنگھ کو جو پہلے ہی سے خائف ہو رہا تھا اپنے لشکر میں طلب کیا اور اس کے ساتھ پگڑی بدل کر ہمیشہ بھائی چارہ قائم رکھنے کی قسم کھائی۔ اس کے بعد وہ امرتسر واپس چلا گیا۔ یہاں پر انگریزی سفیر ۱۰ ڈسمبر کو اس کے پاس پہنچ گئے۔

اسی اثنا میں کلکتے سے ہدایات وصول ہو گئیں۔ فرانسیسیوں کے حملہ کرنے کے عدم امکان کا تقریباً یقین ہوتا جاتا تھا۔ اور ایسے وہمی اندیشے کے مقابلے میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرنا بے سود سمجھا گیا بہر طور کم از کم ایسی رعایت کے قابل نہ تھا کہ ایسے قوی اور بے اصول فرماں روا کو ان ریاستوں پر اقتدار عطا کیا جائے جو اس سے متنفر اور سرکار انگریزی کے زیر حفاظت آنے کی خواہشمند تھیں۔ رنجیت سنگھ کو مطلع کیا گیا کہ گورنر جنرل کو اس کے ستلج کے جنوب کے ممالک میں رسوخ پیدا کرنیکے باطل دعوے کا حال معلوم ہو کر سخت تعجب و تعلق خاطر ہے اور اس سے زیادہ استعجاب اس امر پر ہے کہ وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیئے سرکار انگریزی کی امداد کا خواہاں ہے۔ اسے یہ بھی اطلاع دی گئی کہ سرکار انگریزی دراصل مرہٹوں کی جنھیں اُس نے شکست دی جانشین ہے اور لڑائی کے زمانے میں خود مہاراجہ نے ستلج کو حدِ فاصل قرار دینے کی صلاح دی تھی۔ اس زمانے سے سرکار نے ستلج اس پار کے سرداروں کو تمام قسم کے خراجوں سے بری کر دیا۔ ان کا کسی کا محکوم ہونا گوارا نہ کیا اور انھیں اپنی حفاظت میں بالکلیتہ لے لیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مہاراجہ کا سفیر کے ساتھ برتاؤ خلاف اخلاق تھا اور یہ کہ جبکہ گورنر جنرل سے استمزاج کیا گیا تھا تو ایسے موقع پر اس کا ستلج اس پار کے ملک پر حملہ کرنا خلاف آداب تھا مہاراجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ ستلج کے جنوب کا جس قدر ملک سرکار انگریزی سے معاملہ رجوع کیئے جانے کے بعد فتح کیا گیا ہے وہ واپس کر دیا جائے اور سکھ فوج دریا کے شمال کی جانب واپس طلب کر لی جائے۔

مہاراجہ کو ان شرایط کے متعلق سخت شکایت تھی اور ان کی تعمیل سے پہلو تہی کرنے کی کوشش بیکار تھی۔ اس نے اس کا جواب یہ دیا کہ سفرا تو فرانس کے مقابلے

میں معاہدہ کرنے اور اس کے ساتھ دوامی اتحاد کے استحکام کی غرض سے بھیجے گئے تھے لیکن معاہدہ بالکل فراموش کر دیا گیا اور صرف دوستی کا اظہار اس طور پر کیا گیا کہ اسکی دیرینہ آرزو کے برآنے میں رخنہ اندازی کی گئی۔ وہ اس درجہ ناخوش ہوا کہ لڑائی کیلیئے آمادہ ہو گیا۔ فوج اور سامان جنگ ہر طرف سے اکھٹے کیئے گئے اور امرتسر کے جدید قلعہ گوبند گڑھ میں فوج و رسد لڑائی کے لیئے مہیا کی گئی۔ جنرل لکھم چند جو سکھوں کا بہترین جنرل اور انگریزوں کا سخت دشمن تھا کانگڑے سے واپس طلب کر کے ستلج پر پھلّور کی طرف جو لدھیانے کے محاذ میں تھا روانہ کیا گیا۔ جہاں پہنچکر اس نے اپنا پڑاؤ ڈالدیا۔ اس مخاصمانہ نقل و حرکت کا جواب انگریزوں نے یہ دیا کہ کرنل اختر لونی کے ہمراہ لدھیانے پر ایک فوج روانہ کر دی اختر لونی جب پٹیالے اور نابھے سے ہو کر گزرا تو لوگوں نے اُس کا استقبال بہت کچھ اظہار مسرت و اطمینان سے کیا۔ اس اثنا میں لاہور میں معاملات کے تصفیے میں تعویق ہونے لگی۔ سفیر کو یہ باور کرایا گیا کہ مہاراجہ کا ستلج پر اپنے لشکر میں آکر شامل ہونے سے یہ مقصود ہے کہ جنگ شروع کر دی جائے۔ اور سفیر نے سپہ سالار کو یہ مشورہ دیا کہ پنجاب پر حملہ کیا جائے کیونکہ صرف اس طریقے پر اس ناقابل برداشت حالت کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ آخر مہاراجہ کے مشیروں کی صلاح نیک کارگر ہوئی۔ اور اب اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ مزید مزاحمت بے سود ہے۔ ۱۲ اپریل ۱۸۰۹ء کو اس نے فریدکوٹ کو خالی کر دیا اور انبالے کی فوج ستلج کے شمال کی جانب ہٹالی۔ اب معاہدے کی تکمیل کے لیئے کوئی دقت باقی نہیں رہی اور ۲۵ اپریل کو اس کی تکمیل ہو گئی اور ۳۰ مئے کو گورنر جنرل نے اس پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کی رو سے سرکار انگریزی نے ستلج کے شمال کی جانب مہاراجہ کے ملک و رعایا کے بارے میں مداخلت کرنے سے احتراز کرنے کا وعدہ کیا اور مہاراجہ نے یہ اقرار کیا کہ دریا کے جنوبی قطعۂ ملک کے سرداروں کے مقبوضات تسلیم کیئے جائیں گے۔ ان سرداروں کے بارے میں یہ اعلان بطور تکملہ شایع ہوا کہ سرکار انگریزی نے انھیں اپنے حفاظت میں لے لیا ہے۔ ان کے حقوق و اقتدار میں کوئی مداخلت نہ کی جائیگی اور نہ ان سے کسی قسم کا خراج لیا جائیگا اس شرط پر کہ جب کوئی ایسا دشمن برسر مقابلہ ہو جو اُن کا اور سرکار انگریزی دونوں کا دشمن

ہو تو امداد و معاونت اُن کا فرض ہوگا۔

اس وقت سے لیکر پہلی سکھوں کی لڑائی کے وقت تک ستلج اُس پار کی تاریخ لاہور کی تاریخ سے بالکل علیحدہ رہی۔ مہاراجہ نہایت ایمانداری سے اپنے اقرار پر قائم رہا اور یہ سمجھ کے کہ انگریزوں کی قوت زبردست ہے اس نے ہمیشہ کے لیئے ستلج اس پار کے ممالک پر اقتدار حاصل کرنے کے منصوبے کو ترک کیا اور اپنی توجہ افغانوں کو صوبے کے شمالی اضلاع سے خارج کرنے اور ملتان۔ کشمیر و ڈیرہ جات کو مسخر کرنے کی جانب مبذول کی۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ ۱۸۰۹ء کے اوائل میں آیا درحقیقت وہ آمادہ جنگ ہوا تھا۔ مسٹر مٹکاف کا خیال تو یہ ہے کہ وہ حقیقۃً آمادہ ہوا تھا لیکن اس زمانے میں مہاراجہ کی فراست و عیاری کا کما حقہ علم نہ تھا یہ ممکن ہے کہ وہ شروع سے لیکر آخر تک محض دھمکانے کی غرض سے یہ چال چلا ہو تاکہ سرکار انگریزی کسی طرح اپنے بعض مطالبات سے دست بردار ہو جائے۔ اس ترکیب میں کسی حد تک تو اسے کامیابی حاصل ہو گئی کیونکہ اسے صرف ستلج اس پار کے اضلاع واپس دینے پر مجبور کیا گیا۔ جن پر اس نے اپنی آخری لشکر کشی کے بعد قبضہ کیا تھا۔ اس کے قبل چند سال پیشتر کی لڑائی میں جو ملک اس کے قبضے میں آئے یا اس نے سرداروں کو دیدیئے تھے وہ چھوڑ دیئے گئے گو اسے یہ اجازت نہیں دی گئی کہ ستلج اس پار کے ان سرداروں سے جنھیں اس نے خود ممالک عطا کیئے تھے کسی قسم کی اطاعت کا دعویدار ہو۔

باب دہم

مابعد کی فتوحات

اس باب میں اختصار کے ساتھ یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مہاراجہ کو اپنے حریف مسلمانوں اور دوسرے دشمنوں پر کون کون سی فتوحات حاصل ہوئیں۔ شمالی وسطی اضلاع میں اسنے اسلامی اقوام کو کس طرح مغلوب کیا اور ملتان[1] کشمیر۔ پشاور اور ڈیرہ جات پر کس طرح اس کا قبضہ ہوا۔ ملتان کے قدیم شہر و ضلع میں شاہی نسل کا ایک افغانی خاندان حکمراں تھا جو سنہ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ کے حملے کے وقت نواب کی حیثیت سے مامور کئے گئے تھے چونکہ مغلوں کی حکومت کی مجموعی طاقت میں انحطاط آچلا تھا اس لیئے وہ اس امر کی خواہشمند تھی کہ مرکزی حکومت شکست کرکے ان دور دراز ممالک کو مستحکم کرے جن کو اپنے قابو میں رکھنا اس کے لیئے ناممکن ہوگیا تھا۔ سنہ ۱۷۷۱ء و سنہ ۱۷۷۹ء کے مابین اس شہر پر تھوڑی تھوڑی مدت کے سوا بھنگی سرداروں کا قبضہ رہا اور بالآخر تیمور شاہ نے انھیں نکال باہر کیا اور سنہ ۱۷۷۹ء میں مظفر خاں یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ یہ شخص بہت جری و مستعد تھا اور اسنے سکھوں اور ہمسایہ اقوام سیال وغیرہ کا جو اس پر حملہ آور ہوئے تھے بڑی بہادری سے مقابلہ کرکے اپنی حکومت قائم رکھی۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں مظفر خاں نے نوجوان رنجیت سنگھ کو پہلی مرتبہ دیکھا جبکہ وہ لاہور سے ملک کی خفیہ دیکھ بھال کے لیئے آیا تھا۔ نواب نے شہر سے ۳۰ میل چل کر ملاقات کی اور دونوں سردار باہم ایک دوسرے کو تحائف دیکر صلح و محبت کے ساتھ جدا ہوئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۰۶ء میں جھنگ کو مغلوب کرنیکے

---

[1] مہاراجہ کے ملتان کی لڑائیوں کے پورے حالات سدوزئی کے سرداران ملتان اور دیوان ساون مل کی سوانح عمریوں کے صفحات ۴۷۵ - ۴۸۹ اور ۲۷۲ - ۲۸۵ میں نیز سرداران پنجاب و حالات محاربہ کشمیر مندرجہ سوانح عمری مکھم چند کے صفحات ۵۵۱ - ۵۶۰ درج ہیں۔

بعد رنجیت سنگھ ملتان کی جانب روانہ ہوا اور شہر کے شمال میں ۲۰ میل کے فاصلے پر مہتم کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ نواب کو اس وقت لڑنا منظور نہ تھا اس لیئے اس نے ستر ہزار روپے دیکر اسے رخصت کر دیا۔ دوسرے سال اس کی آتش حرص پھر بھڑک اٹھی اور چونکہ پہلی مرتبہ اسے با آسانی رقم ہاتھ لگ گئی تھی اس لیئے اس نے ملتان پر کثیر فوج کے ساتھ دھاوا کر دیا۔ شہر کے ایک حصّے پر قبضہ کر لیا گیا لیکن قلعے پر فتح پانے کے لیئے سکھ فوج کی تمام کوشش رائیگاں گئی۔ سردار فتح سنگھ کلیان والہ کے ذریعے سے ایک معاہدہ کیا گیا جس کے رو سے رقم کثیر وصول ہونے پر مہاراجہ واپس چلا گیا۔ نواب مظفر خاں نے لڑائی سے تنگ آکر مکّے کا سفر کیا اور واپس آنے پر اس امر کی کوشش کی کہ انگریز اسے اپنی پناہ میں لے لیں۔ مگر بے سود ہوئی انگریزوں نے انکار کیا۔ کیونکہ ملتان دور تھا اس وقت جس حصۂ ملک پر وہ اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتے تھے اس حلقے سے وہ باہر تھا۔

سنہ ۱۸۱۰ء کے اوائل میں رنجیت سنگھ نے پھر ملتان پر چڑھائی کی۔ اس کے ذرا پہلے ہی خوشاب پر اس کی ملاقات شاہ شجاع سے ہوئی اور جلاوطن حکمراں نے سکھوں سے یہ استدعا کی کہ وہ ملتان اپنے قبضے میں لیکر اس کے حوالے کر دیں۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں مظفر خاں نے شاہ شجاع کی فوج کو پسپا کر دیا تھا تالیف قلوب کے لیئے متعدد بار اس نے ملتان میں سکونت کرنے کی اس سے خواہش کی بھی لیکن شاہ شجاع کو یہی دھن لگی رہی کہ شہر و ملک کو فتح کر کے اس کو اپنا بنا لے۔ رنجیت سنگھ نے اس کمزور طبیعت کے بادشاہ کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن جب اس سے کچھ رقم پلّے نہ پڑی تو اس نے بطور خود ملتان پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ۲۴ فروری سنہ ۱۸۱۰ء کو وہ شہر پناہ تک پہنچ گیا اور اس کے دوسرے روز شہر پر قبضہ کر لیا۔

کچھ عرصے تک قلعے پر بے سود گولہ باری ہوتی رہی اس کے بعد سرنگ لگائی گئی لیکن محصورین نے کامیابی کے ساتھ سرنگ کو اڑا دیا جس سے عطر سنگھ کا توپ خانہ اڑ گیا اور عطر سنگھ اور اس کے بارہ آدمی ہلاک ہو گئے ۱۲ مارچ کو پھر جمع ہو کر یکبارگی دھاوا کیا گیا لیکن سکھوں کو نقصان عظیم کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ لشکر میں اب رسد کی قلت ہو گئی تھی اور سکھوں میں بد دلی پھیل گئی۔ دیوان مکھم چند ان کا

سپہ سالار سخت علیل تھا۔ بہت سے سردار مارے گئے تھے اور قلعے کی ایک اینٹ تک نہ اکھڑی تھی۔ ۲۵ مارچ کو دوسرا دھاوا کیا گیا لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا اس لئے مجبوراً محاصرہ برخاست کرنا پڑا اور رنجیت سنگھ کو یہ ذلت نصیب ہوئی کہ مظفر خاں کی سابقہ پیش کردہ شرائط جن کے قبول کرنے سے وہ پہلے انکار کر چکا تھا اب اسے ان پر رضامند ہونا پڑا۔ شرائط یہ تھے کہ ڈھائی لاکھ نقد۔ ۲۰ جنگی گھوڑے اور بوقت جنگ امداد دی جائے۔ مہاراجہ ۳۰ ہزار روپے بطور بیعانہ تاوان وصول کر کے ۱۴ اپریل کو ملتان سے روانہ ہو گیا؀

رنجیت سنگھ نے یہ دیکھ کر کہ اس میں تنہا اتنی قوت نہیں کہ ملتان پر فتح پا سکے گورنر جنرل سے انگریزی فوج بھیجکر کمک دینے کی درخواست کی۔ اس کی اس تحریک پر التفات نہ کیا گیا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس نے یہ بھی تحریک کی کہ بجائے اس کے کہ فوج پنجاب میں سے ہو کر گذرے ستلج کے جنوبی ویران قطعۂ ملک میں سے ہو کر جائے۔ شاہ شجاع نے بھی بطور خود ملتان پر دھاوا کرنے کی تیاری کی لیکن اس میں اتنی سمجھ تھی کہ وہ اس مہم سے جس میں اسے کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی باز رہا؀

فروری ۱۸۱۶ء میں ایک بے قاعدہ حملہ سکھوں نے ملتان پر کیا۔ بھاولپور و ملتان پر ایک دستہ فوج کا خراج وصول کرنے کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔ مظفر خاں کو خراج ادا کرنے میں کچھ دیر لگی تو پھولا سنگھ اکالی نے بھنگ سے بدمست ہو کر دیوانہ وار فدائیوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر پر دھاوا کر دیا اور اس زور شور سے حملہ کیا کہ قلعے کی بالائی فصیل کے ایک حصّے پر قابض ہو گیا۔ لیکن فقیر عزیز الدین نے معذرت پیش کی جس پر مظفر الدین نے رقم خراج جلد ادا کر دی۔ ورنہ وہ اس قدر جلد ہرگز ادا نہ کرتا۔ سکھ فوج منکیرا کی جانب روانہ ہو گئی۔ ۱۸۱۷ء میں سکھ فوج سے دیوان چند کے زیر کمان ملتان کی جانب کوچ کر کے قلعے پر حملہ کیا لیکن پسپا کر دی گئی دس ہزار روپے وصول کرنے کے بعد یہ لوگ واپس چلے گئے۔ یہ کارروائی وقع الوقتی کے طور پر کی گئی تھی۔ اس اثنا میں مہاراجہ ایک بڑی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ ملتان پر جہاں اسے متعدد بار ہزیمت نصیب ہوئی قبضہ حاصل کر کے رہیگا۔ ۱۸۱۷ء کے موسم سرما میں اُس نے ہر طرف سے فوج و رسد جمع کرنا شروع کی اور جنوری ۱۸۱۸ء کو

اٹھارہ ہزار سپاہیوں کی فوج لاہور سے روانہ ہوئی جس کی سرکردگی برائے نام شہزادہ کھڑک سنگھ کے حوالے تھی لیکن دراصل مصر دیوان چند سپہ سالار تھا۔ ملتان جاتے وقت راستے میں خان گڑھ و مظفر گڑھ کے قلعوں پر قبضہ کیا گیا۔ اوائل فروری میں شہر کا محاصرہ کر کے قبضہ کیا اور قلعے پر گولہ باری شروع کی گئی۔ نواب کے پاس صرف دو ہزار آدمی تھے اور قلعے میں محاصرہ برداشت کرنے کے لئے لڑائی کا سامان اور رسد موجود نہ تھی لیکن پھر بھی اس نے ایسی بہادری سے مقابلہ کیا کہ اس سے قبل سکھوں کو کبھی ایسا موقع پیش نہ آیا تھا:

۲ جون تک گولہ باری ہوتی رہی۔ دیوار میں آخر دو شگاف پڑ گئے کیونکہ احمد شاہ والی توپ زمزمہ جو بھنگیوں کے پاس تھی لاہور سے ساتھ لائی گئی تھی اور چار مرتبہ اس کو کامیابی کے ساتھ سر کیا تھا۔ سکھوں نے کئی بار حملے کئے لیکن ہر بار وہ پسپا کر دیئے گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کے ۱۸۰۰ آدمی ضایع گئے۔ قلعے کا دروازہ اڑا دیا گیا لیکن قلعے کے اندر کی فوج نے ان کے روبرو دھس بنا کر سکھوں سے دست بدست لڑائی کی قلعے کی مدافعت کرنے والوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے اب دو تین سو رہ گئی جس میں سے اکثر تو مظفر خاں کے قبیلے یا خاندان کے تھے باقی یا تو ہلاک ہو گئے یا دشمن سے جا ملے کیونکہ انھیں اپنے آقا کا ساتھ چھوڑنے کے لیئے بہت کچھ رشوت دی گئی تھی:

بالآخر ۲ جون کو ایک اکالی نے جس کا نام سادھو سنگھ تھا یہ ارادہ کر کے کہ ۱۸۱۶ء میں پھولا سنگھ نے جو کام انجام دیا تھا اس پر فوقیت لے جائے اپنے چند جری رفقا کے ساتھ قلعے کی فصیل پر حملہ کر کے افغانوں کو اچانک جا لیا اور وہ اس پر قابض ہو گیا سکھ فوج ایسی کامیابی کو دیکھ کر دھاوے میں شریک ہو گئی اور خضری دروازے کے شگاف تک جا پہنچی۔ یہاں بڈھا نواب مع اپنے آٹھوں بیٹوں اور پس ماندہ فوج کے تلوار ہاتھ میں لیئے کھڑا اور مرتے دم تک مقابلے کے لیئے آمادہ تھا۔ افغان کی تیغ براں کی زد نے کشتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ سکھوں نے پیچھے ہٹ کر اپنی توڑیدار بندوقوں سے باڑ مارنا شروع کیا۔ افغان سردار نے للکار کر کہا۔ "مردوں کی طرح سامنے آ کر لڑو"۔ لیکن بھلا سکھ اس دعوت کو کب قبول کرنے والے تھے۔ اس طرح پر

پر سفید ریش مظفر خاں نے پناہ مانگنے سے تنفر کرتے ہوئے اپنے پانچ بیٹوں سمیت داعی اجل کو لبیک کہا۔ چھوٹے لڑکے کے چہرے پر سخت زخم آیا باقی دو نے امان طلب کر لی اور بچ گئے۔ محصور فوج میں سے بھی صرف چند ہی آدمیوں کی جان بچی[51]۔ اور تمام شہر میں لوٹ مار مچ گئی۔ قلعۂ شجاع آباد بھی مسخر کر لیا گیا اور اس میں سے پانچ توپیں لے لی گئیں۔ بعد ازاں ملتان کے شہر پناہ کی مرمت کی گئی۔ ۶۰۰ سو سپاہی قلعے پر متعین کیئے گئے اور سکھ فوج لاہور واپس چلی گئی۔ مشہور یہ تھا کہ ملتان میں بہت دولت ہے۔ مہاراجہ کو صرف دو لاکھ روپے کا حصہ لوٹ میں ملا۔ اس لیئے اس نے یہ حکم دیا کہ تمام عہدہ دار اور سپاہی مال غنیمت واپس کر دیں ورنہ ایک تاریخ معینہ تک واپس نہ کیا گیا اور اس کے بعد بھی ان کے قبضے میں رہا تو اس کی سزا موت ہے۔ اس حکم سے ۵ لاکھ ریاست کے خزانے میں اور داخل ہوئے لیکن ملتان کی غنیمت کا اندازہ ۲۰ لاکھ کیا جاتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال یہ تھا کہ جس کے پاس اس لوٹ کا مال تھا وہ اسے راس نہ آیا۔ بہت سے ایسے لوگ یا محتاج مرے یا لڑائی میں مارے گئے[52]۔

دوسرے سال ۱۸۱۹ء کے موسم بہار میں مہاراجہ نے کشمیر کو اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ ایک عرصے سے اس ملک پر اس کا دانت تھا اور متعدد بار اس پر حملے بھی کیئے گئے مگر بے سود ہوئے تھے۔ اس کی فتح سے اس کے مقبوضات کی مقدار دوگنی ہوگئی۔ پہاڑیوں اور وادیوں کا یہ عجیب خوشنما قطعۂ ملک جو جموں اور پنجاب کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے سے آغاز ہو کر اس بڑے پہاڑ تک پہنچتا ہے جس کی بلندی آلپس سے دوگنی ہے اور جہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے صدیوں سے مختلف فاتحین کا انعام فتحیابی رہا ہے خصوصاً اس کی قدر و منزلت اس لیئے ہوتی رہی کہ یہ موسم گرما کے لیئے ایک خوشگوار مقام ہے جبکہ ہندوستان کی سرزمین دوزخ کا نمونہ

---

[51] مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مارکرافٹ سے جو ایک سیاح تھا یہ بیان کیا تھا کہ پانچسو فوج باقی بچی تھی جسے امان دیگئی۔ لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے حملے کے وقت قلعے میں صرف ۳۰۰ سے زائد لڑنے والے نہ تھے اور ان میں سے بھی بہت سے فصیل کے شگاف میں لڑتے ہوئے مرگئے تھے۔

[52] سرداران پنجاب صفحہ ۴۸۷۔

بن جاتی ہے۔ جو لوگ شمالی جانب سے حملہ آور ہوتے رہے انھیں اپنے وطن طہران وکابل کی خنکی اور خوشنمائی کی یاد ہمیشہ ستاتی رہی اور اس یاد کو وہ کشمیر میں آکر پورا کیا کرتے تھے؛

تیرھویں صدی کے آغاز تک کشمیر میں ہندو راجاؤں کی حکومت رہی اس کے بعد ۲۵۰ سال تک مسلمان خاندان فرمانروا رہا۔ متعدد ناکامیاب مہمات کے بعد ۱۵۸۶ء میں اکبر اعظم نے یہاں مغلوں کی حکومت قائم کی جو ڈیڑھ صدی تک قائم رہی۔ یہی زمانہ تھا کہ منجملہ دوسری پہاڑی اقطاع عالم کے کشمیر کی شہرت اپنی خوشنمائی کی وجہ سے تمام دنیا میں پھیل گئی۔ ذی اقتدار شہنشاہ جو اس زمانے کے یورپ کے حکمرانوں سے کہیں زیادہ متمول اور عیش پسند تھے۔ اور نگ زیب۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں سال بہ سال اس کی خوشنما وادیوں میں پہنچا کرتے تھے اور اپنے تمام دربار کو ہمراہ لیجاتے تھے۔ اس تمام قافلے کی سربراہی میں ملک کی تمام آمدنی صرف ہو جاتی تھی۔ کشمیر میں انھوں نے محلات اور تفریح گاہیں بنائی تھیں ان میں سے بعض اب تک موجود ہیں جن سے ان بادشاہوں کی شان وشوکت اور خود غرضی کا ثبوت ملتا ہے جنھوں نے رعایا سے تو اس قدر تمتع حاصل کیا لیکن اس کا بدلہ بہت کم دیا؛

مغلوں کا خاندان گزر گیا تو اس کے جانشین افغان ہوئے جنھوں نے احمد شاہ درانی کی سرکردگی میں ۱۷۵۲ء میں کشمیر فتح کر کے اس پر حکومت کی۔ اس کی اور اس کے جانشینوں کی حکومت اس درجہ جابرانہ اور ظالمانہ تھی کہ مغلوں کی حکومت اس کے مقابلے میں رحمت معلوم ہوتی تھی۔ ۷۰ سال بعد سکھ اس قطعہ ملک کے حاکم بن گئے اور ان کے بعد یہ ملک راجپوتوں کے ہاتھ لگا۔ جموں کے راجہ گلاب سنگھ کو جو رنجیت سنگھ کا ملازم ومشیر تھا کشمیر اور اس کے مضافات کی حکومت انگریزوں کی جانب سے ۱۸۴۶ء میں دی گئی؛

یہ یاد رہے کہ جموں کا تعلق سکرچکیا خاندان کی قسمت کے ساتھ وابستہ تھا۔ مہاراجہ کے باپ نے اس شہر کو جو اس وقت اس کے بدنصیب رفیق راجہ برج لال دیو کے قبضے میں تھا لوٹ کر غارت کر دیا تھا۔ اس زمانے میں جموں کا کوئی تعلق کشمیر سے نہ تھا۔ کئی ہزار سال سے یہاں کی حکومت راجپوت نسل کے ہندو خاندانوں میں چلی آرہی تھی۔ اور اگرچہ یہ مغل بادشاہوں کا خراج گزار تھا لیکن ان کی سلطنت کے

انحطاط کے وقت اس نے ان کی حکومت سے سبکدوشی حاصل کر لی اور تھوڑے عرصے تک اس آزادی کو برقرار رکھا لیکن سکھوں کی روز افزوں قوت نے اسے مغلوب کر دیا۔ سب سے پہلے بھنگی سرداروں نے اس پر چھاپا مارا اور راجہ رنجیت دیو ان کو خراج دینے پر مجبور ہوا اور اس کے بعد سکرچکیا والوں نے مہان سنگھ کی سرکردگی میں اس کو لوٹا۔ رنجیت دیو کا نام اب تک پہاڑی قطعات ملک میں عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ منصف مزاج اور غیر متعصب منتظم تھا اور یہ امر اس کی رعایا کی بدقسمتی پر محمول کیا جاتا ہے کہ اس میں مدافعت کی اتنی قوت نہ تھی کہ سکھوں کے مطالبات سے انکار کرتا جو نئے مذہب کے جوش میں کٹر ہندو دوں کے لوٹنے میں بھی اسی قدر سرگرم تھے جس قدر وہ مسلمانوں سے متنفر تھے۔ تین بھائی راجگان گلاب سنگھ۔ دھیان سنگھ۔ سچیت سنگھ۔ جو مہاراجہ کے آخری زمانے میں دربار لاہور کے ذی اقتدار اراکین تھے اسی خاندان کے تھے یا کم از کم انھوں نے اپنا شجرہ جو پیش کیا تھا اس سے یہ ان پڑھ فرمانروا مرعوب ہو گیا تھا۔ جموں کی وراثت کے متعلق ان کا حق مرجح سمجھا گیا۔ ان کے راجہ نسل سے ہونے یا نہ ہونے کے قطع نظر ذاتی اوصاف و فراست کے اعتبار سے یہ لوگ ممتاز تھے اور ایسے فرقے میں کامیابی کے زیادہ مستحق تھے جہاں اوصاف حمیدہ حماقت اور صرف مکر و دغا یقینی ذرایع کامیابی تھا۔

۱۸۱۰ء میں مہاراجہ نے کشمیر فتح کرنے کی تیاری کی اور پہلے بھمبر اور راجوری کی پہاڑی ریاستوں کو مغلوب کیا جہاں راجپوت نسل کے مسلمان خاندان حکمراں تھے اس کے بعد دوسرے سال کوٹو کو مغلوب کیا بعد ازاں اس نے کابل کے شاہ محمود کے وزیر فتح خاں کے ساتھ اتحاد کیا جو کشمیر کی تسخیر اور وہاں کے صوبہ دار عطا محمد خاں کو شہر بدر کرنے کے ارادے سے دریائے سندھ کو عبور کر آیا تھا۔ یہ معاہدہ صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ جب ایسا موقع جاتا رہے تو اس کو فسخ کر دیا جائے۔ مہاراجہ اور فتح خاں دونوں کی نیت یہ تھی کہ جس قدر جلد موقع مل سکے ایک دوسرے کے ساتھ چالبازی کرے لیکن فی الوقت اس معاہدے کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں میں کوئی ایک بھی دشمن کی فوج کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں میں سے گزر نہ سکتا تھا۔ جنرل مکھم چند سکھ فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا جس کو کشمیر کے

مال غنیمت میں سے ایک ثلث دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا۔ لکھم چند نے فتح خاں کے ساتھ جہلم سے کوچ کیا جب فتح خاں پیر پنچال پہنچا تو اس نے یہ خیال کر کے کہ مہاراجہ کی عدم مداخلت کے بارے میں کافی احتیاط عمل میں آ چکی ہے اپنی پہاڑی طاقتور فوج کے ساتھ کوچ پر کوچ کرنا شروع کیا اور لکھم چند کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھا۔ سکھ پہاڑوں میں سے کوچ کرنے کے کبھی عادی نہ تھے۔ اور برف باری کی وجہ سے وہ اور بھی بسرعت نہ چل سکے۔ دیوان لکھم چند فتح خاں کی نیت سے واقف ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے اپنے منصوبے سے باز نہ آیا۔ اس نے راجوری کے ایک سردار کو ۵ ہزار روپے اس شرط سے دینے کا وعدہ کیا کہ وہ کوئی ایسا راستہ بتا دے جس پر سے ہو کر وہ فتح خاں کے پہنچتے ہی وادی میں پہنچ جائے۔ وہ جودہ سنگھ کلسیا اور نہال سنگھ اٹاری اور ایک مختصر فوج کو ساتھ لیکر اس راستے پر روانہ ہوا۔ اور اپنے ارادے میں کامیاب ہوا۔ شیر گڑھ اور ہری پربت پر قبضہ کرنے اور وادی کی تسخیر کے عین موقع پر وہ جا پہنچا۔ وادی اور قلعے کی تسخیر کوئی دشوار امر نہ تھا کیونکہ صوبہ دار بھاگ گیا تھا۔ اور اور کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔ لیکن لکھم چند کی فوج بہت مختصر تھی اور اس سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ فتح خاں نے اس امر کا اعلان کیا کہ سکھ مال غنیمت میں کوئی حصہ پانے کے مستحق نہیں ہیں ؛

شاہ شجاع سابق فرمانروائے کابل جو کشمیر میں بطور قیدی رکھا گیا تھا دیوان لکھم چند کے حوالے کیا گیا جو اسے لاہور لے گیا۔ مہاراجہ یہ سن کر بہت ناراض ہوا کہ وزیر فتح خاں نے مال غنیمت میں حصہ دینے سے انکار کیا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس سے اس کا بدلہ لے۔ اس نے کشمیر کے سابق صوبہ دار کے بھائی جہاندار خاں سے نامہ و پیغام شروع کیا جو اٹک کے قلعے پر قابض تھا جہاں سے وہ دریائے سندھ کے راستے کی نگرانی بخوبی کر سکتا تھا مہاراجہ نے جہاندار خاں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ قلعہ سکھوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اب فتح خاں کو ناخوش ہونے کی باری آئی اس نے قلعہ حوالے کر دینے کے لیئے مطالبہ کیا لیکن رنجیت سنگھ نے کہلا بھیجا کہ جب تک کشمیر کے مال غنیمت کا حصہ اسے نہ دیا جائیگا اس وقت تک قلعہ حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ اپریل ۱۸۱۳ء کو فتح خاں کشمیر سے روانہ ہوا اور اپنے بھائی عظیم خاں کو صوبہ دار مقرر کر گیا۔

اب اس نے اٹک کا محاصرہ کیا لاہور سے بعجلت کمک روانہ کی گئی اور پھر بکھم چند سپہ سالار بنایا گیا۔ عرصے تک فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑاؤ ڈالے رہیں وقتاً فوقتاً جنگ ہوتی رہی جس میں سکھوں کا زیادہ نقصان ہوا۔ سکھ کھلم کھلا مڈبھیڑ کرتے ڈرتے تھے۔ قلعے کے اندر کی تمام رسد ختم ہوگئی اور اس وقت اس امر کی ضرورت ہوئی کہ یا تو اس محصور فوج کی مدد کی جائے یا قلعہ بالکل دشمن کے حوالے کر دیا جائے۔ بکھم چند نے اب مقابلے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ حیدرو پر جو اٹک سے چند میل کے فاصلے پر تھا وہ مقابلے کے لیئے صف آرا ہوا۔

لڑائی کا آغاز دوست محمد خاں جو بعد میں کابل کا مشہور فرمانروا ہوا۔ اس نے سواروں کا دستہ لیکے بڑی بہادری سے حملہ کیا جس سے سکھوں کا پرا توڑ دیا سکھوں کی فوج کے ایک بازو میں بالکل بدنظمی پھیل گئی چند توپیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ افغان یہ سمجھ کر کہ کامل فتح حاصل ہوگئی ہے لوٹ مار کرنے کے لیئے منتشر ہو گئے۔ اس وقت دیوان بکھم چند نے خود محفوظ فوج کی سرکردگی کر کے دشمن کو ہر مقام سے بڑے نقصان کے ساتھ پسپا کر دیا۔ فتح خاں اس سے قبل ہی بھاگ گیا تھا کیونکہ اسے یہ خیال ہو گیا تھا کہ دوست محمد خاں مارا گیا ہے۔ افغان فوج کابل کی جانب واپس گئی۔ جہاں پہنچ کر وزیر فتح محمد خاں نے ہرات پر فوج کشی کی تا کہ اٹک کی ناکامیابی کا دھبہ مٹائے۔ حیدرو کی مہم ۱۳ جولائی ۱۸۱۳ء کو سر ہوئی یہ پہلا موقع تھا کہ مہاراجہ نے افغانوں کا مقابلہ میدان مصاف میں کیا۔ اس کا نتیجہ اہم اور آئندہ کے لیئے نہایت مفید ہوا۔ لیکن سکھوں کو جو اعتماد اس موقع پر اپنی ذات پر حاصل ہو گیا تھا اس سے وہ اگلے برس کی شکست سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اگلے سال رنجیت سنگھ نے یہ خیال کر کے کہ فتح خاں موجود نہیں اور افغان فوج درہم برہم ہے کشمیر پر آسانی سے قبضہ ہو جائیگا۔ سیالکوٹ میں جہوں کے نیچے میدان میں فوج کثیر فراہم کر کے وادی کی جانب کوچ کرنے کی تیاری کی۔ دیوان بکھم چند سپہ سالار اعظم بیمار تھا اور چند ہی مہینوں کے بعد اس کا انتقال ہی ہو گیا۔ اس نے مہاراجہ کو باصرار باز رکھنے کی کوشش کی اور یہ سمجھایا کہ موقع مناسب نہیں ہے کیونکہ پہاڑی راجہ دشمن ہو رہے ہیں اور رسد اور بار برداری کافی نہیں ہے۔ لیکن مہاراجہ نے اس کی ایک بات نہ مانی۔ اس نے

خود ایک حصۂ فوج کو کمان میں لیا اور دوسرا حصہ دیوان رام دیال کی سرکردگی میں دیا جو مکھم چند کا پوتا اور ایک دلیر نوجوان تھا اور اس سے پہلے کئی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیکر نام پیدا کرچکا تھا۔ راجہ اگر خاں نے جو راجوری کا راجہ تھا جہاں رنجیت سنگھ نے پہلا پڑاؤ کیا مہاراجہ کو یہ صلاح دی کہ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصے کو اپنے ہمراہ پونچھ کے راستے سے لے جائے اور دوسری کو رام دیال کی سرکردگی میں بہرام گلا کے راستے سے روانہ کرے۔ یہ تجویز پہاڑی راستوں کی دشواریوں کے لحاظ سے گو ضروری ہو لیکن بدقسمتی سے اس کا نتیجہ برعکس نکلا۔ ایک حصہ دوسرے حصے کی مدد نہ کرسکتا تھا اور کارگزار دشمن دونوں کو یکے بعد دیگرے برباد کرسکتا تھا۔ کشمیر کے صوبہ دار نے ایسا ہی کیا اور عین اس وقت جبکہ سکھ کوچ اور سفر سے بالکل تھکے ماندے پیر پنچال کے درے سے نیچے وادی میں اتر رہے ہی تھے اس نے اپنی تمام فوج سے رام دیال کے دستۂ فوج پر حملہ کردیا۔ رام دیال گو بڑی بہادری سے لڑا۔ لیکن دشمن کی فوج کثیر تھی کچھ بس نہ چل سکا اور اس کے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ بہرحال وہ لڑتا بھڑتا وادی کے ایک محفوظ مقام تک جا پہنچا اور وہاں کمک کا منتظر رہا۔ مہاراجہ نے بھائی رام سنگھ کی سرکردگی میں کمک روانہ کی۔ یہ سردار بہت کارگزار تھا مگر رام دیال کی کسی قسم کی مدد نہ کرسکا اور مہاراجہ کے پاس واپس آیا۔ رنجیت سنگھ نے یہ دیکھ کے کہ دشمن کی اس سے بہتر اور فتحمند فوج کے مقابلے میں آگے بڑھنا ناممکن ہے واپسی کا قصد کیا۔ عقب میں پہاڑی راجہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کثرت بارش سے ندی نالوں کے چڑھنے سے راستہ ناقابل گذار ہوگیا۔ سخت دشواریوں اور بھاری نقصان اٹھا کے رنجیت سنگھ پہاڑی راستوں سے نکل کے لاہور واپس آیا۔ رام دیال تنہا رہ گیا تھا مگر اس نے اپنے بل بوتے پر وہ مردانگی دکھائی کہ عظیم خاں کو مجبوراً اس دشمن کے ساتھ تصفیہ کرنا پڑا جس کو وہ ہلاک نہ کرسکا۔ اس نے اسے صحیح سلامت پنجاب واپس جانے دیا۔

یہ مہم کا انجام تباہی اور رنجیت سنگھ کی فوجی قابلیت نے کوتاہی کی۔ لیکن اس کا استقلال فوجی قابلیت سے کہیں زیادہ عجیب و غریب تھا۔ دوسرے سال وہ پھر کشمیر پر قبضہ کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔ یہ موقع اسے فوراً نہ مل سکا۔ کیونکہ

وزیر فتح خاں ہرات و کابل سے واپس آکر اپنے بھائی صوبہ دار عظیم خاں کے ساتھ مل گیا اور دونوں کی متحدہ قوت پر حملہ کرنا مشکل تھا۔ بہرحال رنجیت سنگھ نے راجوری راجہ سے اس کی دغابازی کا بدلہ لیا اور اس کے محل و شہر میں آگ لگادی۔ آخرکار ۱۸۱۹ء میں اسے موقع ہاتھ لگ گیا۔ صوبہ دار کی عدم موجودگی میں اس نے مصر دیوان چند کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج کشمیر کی جانب روانہ کی۔ دیوان چند نے اس سے ایک سال قبل ملتان پر فتح پائی تھی اور رام دیال کو عقب کے فوج کی کمان دی گئی۔ مگر وہ کثرت بارش کی وجہ سے نہ فوراً آگے بڑھ سکا اور نہ لڑائی میں کوئی کام کر سکا۔ لیکن اسوقت مقابلہ بھی کچھ زیادہ نہ ہوا۔ زبر خان جو قائم مقام تھا بھاگ نکلا اور کشمیر کا صوبہ رنجیت سنگھ نے اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ موتی رام دیوان مکھم چند کا بیٹا اور رام دیال کا باپ پہلا صوبہ دار مقرر کیا گیا ؛

اُس وقت سے اس زمانے تک جب انگریزوں نے گلاب سنگھ کو یہ صوبہ عطا کیا یہاں کے حالات سکھوں کے دوسرے اضلاع سے کچھ علٰحدہ نہ تھے بجز اس کے کہ صوبہ لاہور سے دور تھا اس وجہ سے صوبہ دار رعایا کے ساتھ معمول سے زیادہ جبر و تعدی کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے مواخذے سے بالکل مطمئن تھے بعض اوقات ان لوگوں کی جبر و زیادتی اس حد تک ناقابل برداشت ہوجاتی کہ رعایا بغاوت کرتی جو عوام الناس کی جانب سے حکام کے ظلم و زیادتی کا جواب ہوتا ہے۔ مہاراجہ متنبہ ہوکر ظالم نائب کو بدل کے کسی اور کو مقرر کردیتا جس کا لالچ اُس سے کمتر ہو۔ دیوان موتی رام اور اس کا چھوٹا لڑکا کرپا رام بہ ہئیت مجموعی اس سخت زمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے سب سے اچھے صوبہ دار تھے اور ان کا دور حکومت ۱۸۳۱ء تک رہا۔ جس میں صرف دو مرتبہ وقفہ پڑا۔ پہلا تو ایک کاہل شخص تھا جو نظم و نسق کے جھگڑوں میں کم پڑتا تھا دل سے نیک تھا اور لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ جب ۱۸۲۰ء میں اس کا بڑا بیٹا رام دیال ہزارا میں مارا گیا تو اس نے ملازمت کو استعفا دیا تاکہ بنارس جا کر بود و باش اختیار کرے۔ مہاراجہ نے ہری سنگھ نلوا جنگجو سردار کو اس کا جانشین مقرر کرکے روانہ کیا۔ لیکن اس شخص کے خیالات اصول سلطنت کے بارے میں اس قدر دقیانوسی تھے کہ کشمیریوں نے

بغاوت کی اس لیئے موتی رام کو پھر بھیجنا پڑا جو ۱۸۲۶ء تک وہاں صوبہ دار رہا جب کہ راجہ دھیان سنگھ کی افترا پردازیوں سے اس خاندان کی عزت و وقعت مہاراجہ کے دربار میں کم ہوگئی تھی اور اس کی جگہ دیوان چنی لال ایک معمولی شخص ڈیڑھ سال تک کام انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد دیوان کرپارام صوبہ دار مقرر کیا گیا یہ شخص ذی فہم تھا اور باوجودیکہ ویش تھا لیکن اس کے خیالات بہت عالی تھے۔ اس نے راجدھانی میں عمدہ عمدہ عمارتیں اور تفریح گاہیں بنا کے اسے بہت آراستہ کر دیا۔ سری نگر کا رام باغ جہاں مہاراجہ گلاب سنگھ کی یادگار قائم ہے اسی کا لگایا ہوا ہے۔

۱۸۲۸ء میں کشمیر کو زلزلوں کی وجہ سے بہت کچھ نقصان پہنچا بہت سے سرکاری اور رعایا کے مکانات برباد ہو گئے اور بکثرت جانیں تلف ہوئیں۔ زلزلے کے بعد ہیضہ آیا۔ یہ وبا اُس وبا سے زیادہ مہلک تھی جس نے موتی رام کے زمانے میں ملک کو ویران کر دیا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں پھر دیوان کرپارام کو راجہ دھیان سنگھ کی دشمنی کے باعث نقصان اٹھانا پڑا اس نے بھمبر کے راجہ فیض طلب خاں کو اپنی حفاظت میں رکھا تھا جس سے دونوں دوگرا راجہ متنفر تھے اور اس کو قید کر لینا چاہتے تھے اور کرپارام نے اس کے حوالے کرنے سے قطعی انکار کیا تھا۔ اسے کشمیر سے بلا لیا گیا اور اس کے بعد ہی وہ پنجاب سے نکل کے اپنے باپ کے پاس بنارس چلا گیا۔ تین پشتوں تک اس کے خاندان نے مہاراجہ کی خدمت گزاری میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے لیکن اس کی وجہ سے وہ رنجیت سنگھ کی ناقدری کے سلوک سے محفوظ نہ رہ سکا۔ رنجیت سنگھ کو ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہ ہوتی تھی جو اپنا کام کر چکتے تھے یا جن سے اس کا کوئی نیا منظور نظر برسر پرخاش ہوتا تھا۔ رنجیت سنگھ کی یہ خودغرضی اور وفادار اشخاص کے ساتھ بدسلوکی کرنیکے بہت ہی بدنما دھبے اس کے دامن پر ہیں۔ دیوان مکھم چند جو دیوان خاندان کا بانی تھا اس کا بہترین فوجی افسر تھا جسے ہمیشہ کامیابی حاصل ہوتی رہی اور زیادہ تر اسی کی فوجی قابلیت کی بدولت مہاراجہ پنجاب کا بلا شرکت غیرے حاکم بنا۔ لیکن یہ تمام خدمات اس کے بیٹے موتی رام یا اس کے پوتے کرپارام کو تذلیل تاوان ضبطیٔ جائداد اور بالآخر انھیں برباد ہونے سے نہ بچا سکیں ؛

۱۸۰۹ء میں مہاراجہ نے کانگڑا اور اس کے گرد و نواح کے پہاڑی اضلاع کو پورا کر لیا تھا۔ یہ واقعہ بھی اس کی فطرتی دغابازی کی یادگار رہیگا۔ راجہ سنسر چند کٹھوچ راجپوتوں کے شریف ترین خاندان کا سرگروہ تھا اور اس کی ذاتی قابلیت اور قدامت خاندانی کی وجہ سے اس کی بڑی تعظیم کی جاتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں جب کہ ہل چل مچی ہوئی تھی اس نے آس پاس کے راجپوت ریاستوں پر اپنی حکومت قائم کر لی اور کئی بار دشمنوں کے باہم متحد ہو کر برسرمقابلہ ہوئے لیکن وہ مدافعت میں کامیاب رہا۔ ۱۷۸۴ء میں اس نے سردار جے سنگھ کنھیا سے کانگڑا کا مشہور قلعہ حاصل کیا جسے اس زمانے کی فوج اور توپ خانہ مسخر نہ کر سکتا تھا اور جس پر قبضہ ہونے سے آس پاس کے ملک پر اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ مہاراجہ عرصے سے اس کارآمد جگہ سے اس کو بیدخل کرنے کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ یہ موقع اسے اس وقت نصیب ہوا جبکہ کہلور راجہ مان سنگھ کے بلانے پر گورکھوں نے کانگڑا پر حملہ کر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے کئی سال تک طول کھینچا اور سنسر سنگھ مستقل مزاج دشمن کو آخر تھکا دیتا لیکن کیسی بری گھڑی تھی کہ اس نے رنجیت سنگھ سے مدد چاہی جس نے طرفین سے سازش کر کے قلعے پر قبضہ کر لیا اپنی فوج کو نیپال کے جنرل راجہ امر سنگھ تھپہ کی امدادی فوج ظاہر کیا۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی اس نے دونوں راجپوت اور گورکھوں پر قہقہہ لگایا اور خود قلعے پر قابض ہو گیا۔ یہ دھوکے کی چال بہت کامیابی کے ساتھ انجام دی گئی اور ویسی ہی اس تحسین کی اور قدر کی سزاوار ہے جو تواریخ میں ایسی غداریوں کی ہوتی رہی ہے۔

اس واقعے کے کئی سال بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کانگڑا کی تمام ریاستوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے ملک میں شامل کر لیا۔ راجہ سنسر سنگھ مر چکا تھا۔ اس کا بیٹا انرودھ سنگھ اپنی ریاست میں باجگزار کی حیثیت سے تھا راجہ دھیان سنگھ نے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ہمیشہ برائی کی ترغیب دیتا اور اپنے آپ کو جموں کے قدیم خاندان کا جائز وارث ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا مہاراجہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انرودھ چند کی بہن کی شادی اسکے بیٹے ہیرا سنگھ کے ساتھ کرادی جائے جو ایک خوبصورت نوجوان اور دربار میں

ہر دلعزیز تھا۔ مغرور راجپوت نے جو کٹوچ خاندان کی اولاد ہونے کی وجہ سے ڈوگرا راجہ کو نو دولت سمجھ کے نظر حقارت سے دیکھتا تھا اس نسبت سے قطعاً انکار کیا اور اپنے خاندان کو ہمراہ لیکر لاہور سے ستلج عبور کر کے سرکار انگریزی کی حفاظت میں چلا گیا۔ مہاراجہ نے اس دو ٹوک جواب سے ناراض ہو کر اس کی تمام جائداد ضبط کر لی اور اگلے سال ۱۸۲۹ء میں اس راجپوت راجہ کا سر نیچا کرنے کے خیال سے اس نے خود انرودھ چند کی دو ناجائز سوتیلی بہنوں سے شادی کر لی جن میں سے ایک تو اس کی زندگی میں مر گئی اور دوسری اس کے مرنے پر ستی ہوئی۔

مہاراجہ کے پشاور اور ہزارہ کے پہاڑی ملک کی فتح کا مختصر ذکر مناسب ہے یہ بڑی طولانی اور دشوار مہم تھی جس میں اس کا بہت سا روپیہ افسر اور فوج ضائع ہوئی نیز پنجاب کے اسلامی قبایل کے مغلوب کرنے کا حال جو ویسے ہی جنگجو اور بہادر تھے جیسے سکھ۔ ان فرقوں میں جس چیز کی کمی تھی وہ صرف یہ تھی کہ ان میں باقاعدہ انتظام اور ایکا نہ تھا۔ اور یہی اوصاف تھے جو مہاراجہ میں نمودار تھے اور جس کی وجہ سے وہ ان فرقوں سے ہر ایک کو جداگانہ مغلوب کر سکتا تھا اگر یہ باہم متفق ہو جاتے تو بڑی کامیابی سے ہٹا سکتے تھے۔ کوئی مسلمان ایسا قابل نہ تھا جو اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سبز نشان کے نیچے اپنے ہم مذہبوں کو جمع کر کے شمالی پنجاب میں ایسی اسلامی سلطنت قائم کر سکتا جو لاہور کی سکھ حکومت کی حریف اور مد مقابل ہوتی۔ چند اشخاص نے جن میں مجنونانہ مذہبی جوش تھا مثلاً سید احمد شاہ پہاڑی نے لڑنے والوں کی متضاد جماعتوں کو اکٹھا کر کے بے انتہا سراسیمگی پیدا کر دی اور سکھوں اور دوسرے کافروں کے خلاف جہاد کرنے کا وعظ کیا لیکن انکا جوش پھوس کی آگ کے مثل بھڑک کے رہ گیا۔ انھوں نے صرف بگاڑ دیا مگر کچھ بنا نہ سکے۔ موٹی سمجھ والے۔ قوی اور اپنی ہٹ کے پورے سکھوں کو لازمی طور پر فتح نصیب ہوئی اور وہ اسکے مستحق تھے جن کی رہنمائی پر ان کا مستقل مزاج مہاراجہ تھا جس کا عمل دریا کے چڑھاؤ کی طرح آہستہ مگر یقینی اور ناقابل مزاحمت تھا۔

سکھوں اور ان کے راجہ کے حالات سے انگریز ناظرین کو

غلط فہمی ہوگی اگر یہ خیال ذہن نشیں ہو جائے کہ پنجاب ایسا صوبہ ہے جس میں خصوصاً ہندو لوگ بستے ہیں اور اس میں پکے ہندو مذہب کے خلاف گرو گوبند سنگھ جس کا بانی تھا جو اس مذہب کے تابع تھے دفعتہً اور غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی۔ پنجاب آج بھی اور رنجیت سنگھ کے زمانے میں بھی ہندو مسلمان دونوں میں تقریباً مساوی طور پر منقسم ہے۔ جنوبی اور وسطی اضلاع کے بڑے شہروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن عموماً یہ کہا جاسکتا ہے دریائے چناب کے مشرقی اضلاع میں ہندو ہیں اور مغرب میں مسلمان۔ جس قدر ہم سرحد اور پہاڑی سلسلوں کی طرف بڑھتے چلے جائیں ہندو آبادی کی مقدار فیصدی برابر کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ سرحدی اضلاع کی آبادی میں تریب قریب مسلمان ہی پائے جاتے ہیں بجز تجارت پیشہ یا ساہوکاروں کے جو اکثر ہمیشہ ہندو ہوتے ہیں۔ یہاں تک وسط ایشیا کے شہروں میں جہاں تعصب زیادہ ہے یہ لوگ آباد اور خوشحال ہیں۔ مسلمانوں کے بہت سے فرقے قدیم ہیں اور بہت اہمیت رکھتے ہیں جنہیں گھکر۔ جودرہ۔ جنجوعہ۔ آوان۔ توانا۔ سیال۔ کھرال۔ کھتّر۔ غیبا۔ اور گوکھر خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو لاہور کے مغربی سمت کے غیر کوہستانی ملک یا دریائے سندھ اور چناب دریاؤں[1] کے درمیان بہھڑ اور کوہستانی ملک میں آباد ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے آپ کو پردیسی نسل سے بیان کرتے ہیں مثلاً گھکر فارس سے آوان افغان یا باختری یونانیوں سے لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ سمجھا جائے کہ یہ اُن لوگوں کے ماورا ہیں جو ایرانی نسلیں ہندوستان میں متواتر فاتحین کے ساتھ دریائے موّاج کی طرح نازل ہوئی تھیں۔ ان فرقوں کے گذشتہ حالات سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ان کے ماقبل کے واقعات راجپوت اور جاٹوں سے کسی خصوصیت کے ساتھ مختلف تھے۔ دوسری اور ہندو ذاتوں کی طرح ان پر بھی صحیح اور حقیقی طور پر ہندی الاصل کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کے ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کرنے سے ان کی قومی خصوصیات کو تغیر یا نقصان پہنچنے کے بجائے اور

[1] ان فرقوں کے تفصیلی تاریخی حالات پنجاب کے سردار صفحات ۵۰۲-۶۰۶ میں درج ہیں؛

مستحکم کر دیا۔ ان فرقوں میں سے اکثر کا باہمی تعلق عام آشکارا ہے توانا۔ سیال غیبا اور بہاولپور کے داود پتر سب کے سب یکجدی ہیں گو موخر الذکر اپنا سلسلۂ نسب حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملا کے دل خوش کرتے ہیں (جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار تھے)۔ لیکن یہ لوگ اور پنجاب کی دوسری قدیم ذاتوں کی طرح راجپوت نسل کے ہیں۔ غالباً پنجاب پر راجپوتوں نے تین مرتبہ چڑھائی کی پہلے تو اس زمانے میں جبکہ تاریخ کی بنیاد ہی نہ پڑی تھی تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح۔ کھٹوچ اور چمبہ اور جالندھر کی پہاڑیوں کے راجگان جن کے آبا و اجداد باری اور رچنا کے دوآب پر حکمراں تھے اب ان لوگوں کے یادگار ہیں دوسرا نقل مکان اس کے ایک ہزار سال واقع ہوا اس وقت ادجمید انے جو ہستناپور کی ریاست کے بانی کا فرزند تھا۔ اپنے یادو راجپوتوں کو جہلم کے شمالی جانب لیجاکر ایک خاندان کی بنیاد ڈالی جس کی حکومت اس قطعۂ ملک پر رہی جو راولپنڈی سے لیکر ملتان تک پھیلا ہوا ہے۔ سب سے آخر تارک وطن جنوب کی سمت سے آئے جن کا سلسلہ عرصے تک وسویں صدی عیسوی سے لیکر پندرھویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ اس وقت مختلف اقوام کے راجپوت پنجاب میں آئے۔ انھیں کی اولاد جاٹ۔ توانا۔ سیال۔ غیبا۔ گوکھر اور دوسرے مشہور فرقے ہیں۔

ہندوستان کی دیسی فوج کا ممتاز حصہ مسلمان ہیں۔ اگرچہ میں نے اس سے قبل یہ بیان کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی صلح و جنگ۔ امن چین کے زمانے میں چھاؤنیوں کی مخرب اخلاق زندگی یا لڑائی کے ہولناک جوش و خروش میں سکھ بہترین فوجی مواد تصور کیے جاتے ہیں لیکن پنجابی مسلمان بھی ان سے کچھ ہیٹے نہیں ہیں۔ لڑائی کے مواقع پر ان کا جوش و خروش اور بھی زیادہ ناقابل مزاحمت ہوتا ہے اور ان کی بہادری اور جنگ کا شوق ویسا ہی بڑھا ہوا ہے جیسا کہ سکھوں کا لیکن لڑائی کے رک جانے پر انقلاب یا شکست کے موقعوں پر ان کا استقلال سکھوں کا سا نہیں اور نہ وہ امن کے زمانے میں اپنے وطن سے دور فوج میں رہکر کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ سکھوں کی طرح عام طور پر مفید نہیں ہیں۔

وہ ان کی طرح غیر متاثر اور فوجی خدمت میں برائی بھلائی باتوں کو یکساں طبیعت نہیں رکھ سکتے۔ لیکن وہ اعلیٰ درجے کے سپاہی ہیں۔ چنانچہ توانا۔ سیال اور ملتانیوں نے ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی طرف جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیکر امتیاز حاصل کیا ؛؛

مہاراجہ نے پہلے ان فرقوں پر حملہ کر کے مغلوب کیا جو لاہور کے گردونواح میں تھے۔ سب سے پہلے کھرال سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی جن کے ۴۰ مواضعات شیخوپورہ اور جھنگ کے قریب تھے۔ یہ لوگ بہت شورہ پشت اور چور تھے اور کسی کی ماتحتی انھیں گوارہ نہ تھی۔ دوسرے مسلمان فرقوں کی بہ نسبت ان میں مذہبی غلو زیادہ تھا۔ انھوں نے ہندوؤں کی حکومت کو بڑے اکراہ سے مانا اور دیوان ساون مل اور دوسرے سکھ سرداروں کو ان کی روک تھام کرنے میں اپنی تمام قوت صرف کرنی پڑی کیونکہ جب کبھی کوئی باقاعدہ فوج ان کے مقابلے پر روانہ کی جاتی تو یہ لوگ گھنے جنگلوں اور وادیوں میں جا چھپتے اور وہاں ان کا تعاقب کرنا دشوار ہوتا۔ ۱۸۰۳ء میں مہاراجہ نے ان کا علاقہ اپنے ملک میں شامل کر لیا اور اس کے بعد ان کے پڑوس سیال کی جانب رخ کیا جو جھنگ۔ لیہہ اور چنیوٹ کے قریب رہتے تھے اس نے ان کے سردار احمد خاں سے ساٹھ ہزار سالانہ خراج وصول کیا اور تین سال کے بعد ان کا ملک چھین کر سردار فتح سنگھ کلیان والہ کو زراعت کے لئے دیدیا۔ توانا اس وقت اس قدر قوی تھے کہ ان پر کھلم کھلا حملہ کرنا دشوار تھا گو کہ ۱۸۰۳ء میں مہاراجہ نے ان کے سردار خان بیگ خاں کو عیاری سے گرفتار کر کے اس کے بھائی کے پاس بھیجدیا جس نے اسے قتل کر دیا۔ رنجیت سنگھ کو اس کے معاوضے میں ایک لاکھ روپے مل گئے۔ ۱۸۱۷ء سے قبل وہ توانا کے سردار پر بمقام نور پور حملہ کر کے اس کا قلعہ فتح نہ کر سکا گو احمد یار خاں نے جو اس وقت سردار تھا پھر اپنا ملک واپس لے لیا لیکن یہ قبضہ عارضی تھا۔ منکیرہ کے نواب کی مدد سے جو اس کا رقیب و دشمن تھا رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کرنے پر وہ مجبور کیا گیا۔ ۱۸۲۱ء میں جب مہاراجہ نے منکیرہ کے نواب حافظ احمد خاں پر حملہ کیا تو اوس وقت توانا کو بدلہ لینے کا

موقع ہاتھ آیا۔ یہ لوگ بہت جوش وخروش سے اس مہم میں شریک ہوئے منکیرہ عین صحرا میں واقع تھا اور اس کے گرد ۱۲ قلعے تھے جن سے باہر ملک میں کہیں ایک بھی کنواں نہ تھا۔ اس لیئے اس کام میں بہت دشواریاں تھیں۔ مہاراجہ بذات خود فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس کا استقلال تمام قدرتی دشواریوں پر غالب آیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا اور راستے میں کنویں کھدواتا چلا گیا اور بالآخر قلعے کا محاصرہ کرلیا جو ۲۵ دن کے بعد حوالے کر دیا گیا۔ نواب کو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی صوبہ داری پر بحال رکھا جو نہایت شورش انگیز ضلع تھا جس کو سکھ قابو میں نہ رکھ سکتے تھے۔

اس مہم میں توانوں نے اس درجہ بہادری ظاہر کی کہ مہاراجہ نے ان میں سے ۵۰ اشخاص کو اپنے ہمراہ لیجا کر اپنے ذاتی محافظ دستہ فوج میں مامور کیا۔ یہ لوگ درحقیقت بڑے خوش رو ہوتے ہیں۔ مجھے اب تک فتح شیر خاں اور شیر محمد خاں دو توانا سرداروں کی صورتیں یاد ہیں جو ایک دوسرے کے رقیب تھے اور جنھیں میں نے ۱۸۶۴ء میں لارڈ لارنس کے دربار کے موقع پر لاہور میں دیکھا تھا۔ اس مشہور تاریخی موقع پر یہ دونوں تمام مجمع میں سب سرداروں سے زیادہ وجیہ نظر آتے تھے۔ قصور کا شہر جو لاہور سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر ہے ایک مسلمان پٹھان خاندان کا صدر مقام تھا جس نے اٹھارہویں صدی کے نصف اواخر میں سکھوں کی مدافعت نہایت کامیابی کے ساتھ کی اور جو ۱۸۰۱ء میں رنجیت سنگھ کے لاہور لینے کے موقع پر اس کے خلاف اتحاد میں شریک ہو گیا تھا۔ مہاراجہ نے کئی مرتبہ اس خاندان پر حملہ کیا اور ۱۸۰۷ء میں اس نے اپنی تمام فوج لیکر قصور پر چڑھائی کی اور نواب قطب الدین کو نکال باہر کیا۔ نواب قطب الدین اپنی ریاست واقع ممدوٹ میں چلا گیا جو ستلج کے جنوبی کنارے پر تھی اور جس پر اب تک اس کی نسل کے لوگ قابض ہیں۔

گھکروں کا شجاع فرقہ جس نے ہندوستان کی تاریخ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کئی سال تک کشمیر پر حکومت کرتا رہا اور ہندوستان کے حملہ آور شاہنشاہوں کے ساتھ شان وشوکت سے شریک کارزار رہا۔

سلطان مقرب خاں کی شکست کے بعد جو ۱۷۵۶ء میں گجرات کی فصیل کے نیچے سردار گجر سنگھ کے مقابلے میں ہوئی تھی سکھوں سے عہدہ برا نہ ہو سکا۔ اسوقت اضلاع گجرات۔ راولپنڈی کا ایک حصۂ کثیر اور جہلم گھکروں کے قبضے میں تھے۔ مہاراجہ کے نائب بدھ سنگھ سندھن والیہ اور جموں کے گلاب سنگھ کے جبر و تعدی نے انھیں پامال کر دیا۔ ۱۸۱۸ء میں ان کا رہا سہا اقتدار بھی جاتا رہا۔ سرکار انگریزی ہی کا حصہ تھا کہ اس خاندان کی گم شدہ دولت کسی قدر پھر اس کے ہاتھ لگی:

آوان فرقہ اس قدر پراگندہ تھا کہ سکھوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ نکر سکتا تھا۔ ان کا خاص گانوں شمس آباد جنرل مکھم چند نے ۱۸۱۳ء میں اس پاداش میں برباد کر دیا کہ ان لوگوں نے اٹک کے محاصرے کے وقت کابل کی فوج کی مہانداری بجبر و اکراہ کی تھی۔ لیکن ان کے موروثی مقبوضات سے جو راولپنڈی جہلم اور شاہ پور میں واقع تھے کوئی تعرض نہیں کیا گیا صرف انھیں ان اضلاع کے سکھ صوبہ داروں کو خراج ادا کرنا پڑا۔ جنجوہیوں کے ساتھ بھی یہی پیش آیا جن کی دوستانہ شرکت مہاراجہ کے والد مہان سنگھ کے ساتھ تھی:

جب ایک قدیم راجپوت فرقہ کانگڑا۔ جموں اور گجرات کے پہاڑی اضلاع میں منتشر تھا۔ اس میں سے اکثر مسلمان ہو گئے تھے لیکن کانگڑے میں یہ لوگ اپنے اصلی مذہب کے پابند تھے۔ بھنگی سرداروں و نیز مہان سنگھ سکراچاکیا نے اکثر ان پر چڑھائی کی لیکن ان کا ملک بہت دشوار گزار تھا اور ان کو مغلوب کرنا مہاراجہ کے نصیب میں تھا۔ ۱۸۱۰ء میں سردار صاحب سنگھ سے گجرات لینے کے بعد رنجیت سنگھ نے راجہ عمر خاں چب سردار کے دو مستحکم قلعوں چونیاں اور منگھا کی طرف رخ کیا وہ اطاعت پر مجبور ہوا اور اس کی وفات کے بعد جو چند ہی ماہ کے بعد واقع ہوئی اس کے تمام مقبوضات ضبط کر لیئے گئے:

اسی سال مہاراجہ ساہوال کے بلوچ سردار فتح خاں کے مقابلے کے لیئے روانہ ہوا۔ فتح خاں بڑا ذی اقتدار تھا اس نے کامیابی کے ساتھ بھنگی سرداروں

سے مقابلے کئے اور ان سے بہت سے مفتوحہ اضلاع واپس چھین لیئے - مہاراجہ کے باپ نے اسے خفیف رقم بطور خراج ادا کرنے پر مجبور کیا تھا - سنہ ۱۸۰۴ء میں رنجیت سنگھ نے اس رقم میں بہت کچھ اضافہ کر دیا - یہ رقم باقاعدگی سے ادا نہ کیجاتی تھی - یہ ایک بہانہ الحاق کے لیئے مل گیا اور مہاراجہ نے بڑی آمادگی سے اس سے فائدہ اٹھایا - سنہ ۱۸۱۰ء میں اس نے فتح خاں پر چڑھائی کر کے یکبارگی قلعے پر قبضہ کر لیا اور فتح خاں کو اپنے ہمراہ لاہور لے گیا جہاں اُس کو معقول جاگیر عطا کی گئی - فتح خاں چند سال تک تو رہا - لیکن بیکاری سے تنگ آکر وہاں سے بھاگ گیا اور ادھر اُدھر پناہ ڈھونڈھتا پھرا - بالآخر سنہ ۱۸۲۰ء میں بہ حالت جلاوطنی بہاولپور میں اس کا انتقال ہو گیا؛

اس طور پر یکے بعد دیگرے تمام مسلمان سردار مغلوب ہو گئے اور مہاراجہ کو سب پر فوقیت حاصل ہو گئی - سنہ ۱۸۲۰ء میں تو اس کی قوت گویا تمام پنجاب میں قطعی طور پر ستلج سے لیکر دریائے سندھ تک مستحکم ہو گئی جنوب میں انگریزوں کے زیر حفاظت ریاستیں اس کو روکے ہوئے تھیں اور شمال میں کابل کا افغان فرمانروا حق فتح اور احمد شاہ درانی اور تیمور کے نام سے شمالی ہند کی حکومت کا دعویدار تھا؛

حیدرو کی لڑائی کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے جس میں سکھ فوج نے وزیر فتح خاں اور دوست محمد خاں کو جو آخر میں امیر کابل ہو گیا اٹک کی فصیل کے نیچے شکست دی تھی - اس کے بعد دیوان رام دیال کے کشمیر سے اخراج - مہاراجہ کے بربادی کے ساتھ ہزیمت کرنے اور سنہ ۱۸۱۹ء میں بالآخر اس صوبے کو مطیع کرنے کے واقعات پیش آئے - ہزارہ کے شورہ پشت مسلمان فرقوں کا مغلوب کرنا بڑا مشکل کام تھا - انگریزی فتوحات کے بعد بھی انھوں نے اس قدر شورشیں برپا کیں کہ اکثر فوجی مہمات ان کے مقابلے پر روانہ کرنا پڑیں - سکھ پہاڑی لڑائیوں کو پسند نہ کرتے تھے - بخلاف اس کے افغان اور یوسف زئی میدانوں کے مقابلے میں پہاڑی مقامات میں زیادہ اطمینان سے لڑ سکتے تھے اور ان کے حملہ کرنے کے قومی طریقے نے جنگلی و پہاڑی قطعات ملک میں نشو ونما

پایا تھا جہاں وہ برسرپیکار رہا کرتے تھے۔ ہزارے کا صوبہ دار حکما سنگھ چمنی بہادر سپاہی لیکن ظالم منتظم تھا ۱۸۱۴ء میں وہ اٹک و ہزارے کی کمان پر مقرر کیا گیا تھا جب کہ اس نے فوجی کارگزاری نمایاں طور پر انجام دیکر اٹک کے قلعے سے افغانوں کو نکال دیا تھا جس کو افغانوں نے پھر دفعتہً فتح کرلیا تھا۔ اس کی خود سری اور بالخصوص اس کے ایک ذی اقتدار اور متموّل سردار سید خاں کے پھانسی دینے سے تمام ملک میں اشتعال کک پیدا ہوگئی اور مہاراجہ ۱۸۱۹ء میں پھر اسے واپس طلب کرنے اور دیوان رام دیال کو اس کے بجائے مامور کرنے پر مجبور ہوا۔

نوجوان و ناعاقبت اندیش جنرل بمعیت شیر سنگھ جو برائے نام کمیدان تھا اور فتح سنگھ اہلو والیہ پہاڑی راستے سے ہوکر گندگرڑھ تک پہنچا جہاں یوسف زئی اور سوات جرگے مقابلے کے لیئے مجتمع تھے دشمنوں کی تعداد سکھوں سے زیادہ تھی۔ اور ان جرگوں کو سابق صوبہ دار پر متعدد بار فتح حاصل ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر اعتماد ہوگیا تھا۔ سورج غروب ہونے تک لڑائی جاری رہی سکھ تھک کر اپنے مورچے پر واپس آگئے دیوان رام دیال مع اپنے مختصر محافظ دستے کے سب سے آخر میدان سے واپس ہوا۔ اور دشمن نے اسے فوج سے علیحدہ دیکھکر اس پر دھاوا کردیا اور سخت مقابلے کے بعد اس کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو مار ڈالا۔ سکھوں نے جب دیکھا کہ ان کا جنرل مارا گیا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور دوسرے روز بھاگ کھڑے ہوے۔ واپسی میں جس قدر مواضعات ان کے راہ میں پڑے ان سب میں آگ لگاتے گئے۔ رام دیال کی موت کا فوج کو بہت صدمہ ہوا لیکن اور بہت سے قابل عہدہ دار اس کی جگہ کام کرنے کے لیئے موجود تھے جن میں سے ہری سنگھ نلوا اور بدھ سنگھ سندھن والیہ مہاراجہ کا رشتے کا بھائی زیادہ ممتاز تھے۔ رام دیال کی جگہ ہزارے کی صوبہ داری پر مجیٹھ سرداروں میں کا ایک سردار امر سنگھ مامور کیا گیا۔ اس پر بھی وہی گذری جو رام دیال پر گذری تھی۔ اسے بھی اسی طریقے سے دھند اور تریں جرگوں نے ہلاک کیا کیونکہ جب ایک گھمسان معرکہ آرائی کے بعد یہ اپنے محافظ دستہ فوج کے ساتھ آرام لے رہا تھا کہ اس پر یورش کی گئی اور وہ قتل ہوگیا۔

سنہ ۱۸۲۳ء میں پیشاور کا شہر اور صوبہ مہاراجہ کا باجگزار ہوگیا۔ اس وقت اس پر افغان حکمراں کی جانب سے یار محمد خاں مامور تھا۔ یار محمد خاں کا بھائی محمد عظیم خاں فتح خاں کے بجائے برائے نام وزیر لیکن دراصل کابل اور شمالی افغانستان کا حکمراں ہوگیا تھا۔ محمد عظیم خاں اپنے بھائی پیشاور کے صوبہ دار سے اس وجہ سے ناراض ہو کر کہ اس نے مہاراجہ سے دوستی اور اطاعت کا معاہدہ کیا کابل سے کثیر فوج لیکر روانہ ہوا اور راستے میں یوسف زئیوں کے وحشی جرگے کو سکھوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا۔ نوشہرہ کے قریب تھری کے مقام پر جو اٹک اور پیشاور کے درمیان میں تھا سکھوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ ایک معرکتہ الآرا مقابلہ تھا اور اس سے ہمیشہ کے لئے یہ فیصلہ ہوگیا کہ خیبر کے شمال اور شمالی مغربی سرحد پر سکھوں کی حکومت رہے یا افغانوں کی۔ مہاراجہ بذات خود دریائے کابل کے بائیں جانب فوج کی کمان کرتا تھا جہاں یوسف زئی ٹھیرے ہوئے تھے۔ سکھ فدائی اکالی اور مسلمان غازیوں کی باہم دست بدست لڑائی ہوئی۔ اس مقابلے میں اکالیوں کو بالآخر ہزیمت نصیب ہوئی ان کا سردار پھولا سنگھ جس سے لوگ عام طور پر خائف تھے مارا گیا۔ لیکن مہاراجہ نے ان جرگوں کو بھگا دیا۔ دریا کے دوسری جانب سردار ہری سنگھ نلوا نے جو سکھوں کی اصل فوج کا کمیدان تھا جنرل ونٹورا جمعدار خوشحال سنگھ اور سردار بدھ سنگھ سندھن والیہ کے ساتھ افغان فوج کا مقابلہ کیا جو اعظم خاں کے زیر کمان تھے اعظم خاں نے عرصے تک مقابلہ نہ کیا بلکہ پیشاور کی طرف روانہ ہو کر دروں میں چلا گیا۔ مہاراجہ نے شہر کو لوٹ لیا اور اس کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ جاتے وقت وہ یار محمد خاں کو اس شرط پر صوبہ دار مقرر کر گیا کہ وہ سالانہ خراج ادا کیا کرے۔

اس وقت سے ہزارہ پیشاور اور سرحدی اضلاع ہمیشہ مہاراجہ کے لئے باعث تکلیف رہے جہاں اس کو بہت کچھ مصارف برداشت کرنا پڑے۔ بارق زئی سرداروں اور غیر تربیت پذیر و مذہبی دیوانہ جرگوں سے متواتر بر سر مقابلہ ہونے کیوجہ سے اس کے بہت سے بہترین عہدہ دار اور فوجیں ضایع ہوئیں سرحد کی طویل اور ایک ہی نوعیت کی لڑائیوں کے ذکر کی اس مختصر رسالے میں گنجائش نہیں ہے۔

اس صورت حال میں سید احمد شاہ کی وجہ سے اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ یہ صاحب نصیر آباد کے رہنے والے تھے جو شمالی مغربی صوبے میں واقع ہے۔ سید احمد شاہ نے اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کی دینی حمایت میں سکھوں کی مدافعت پر آمادہ ہو کر پیشاور کے پہاڑی ملک میں تبدیل وطن کر کے سکونت اختیار کی۔ انھوں نے کافروں کے بر خلاف جہاد کرنے کا وعظ شروع کیا۔ یہ ہندوستانی وہابی فرقے کے بانی تھے۔ اس فرقے کی وجہ سے مختلف مواقع پر حکومت ہند کو بہت کچھ پریشانیاں لاحق ہوئیں گو اس کے بہت سے افراد وفادار اور پابند قانون ہیں جو دوسرے مسلمانوں سے عبادت کی سادگی کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ دیگر افراد جو تند خو باغی تھے اور جن میں مذہبی دیوانگی تھی ہمیشہ سرکار سے برسر مقابلہ رہے اور شورش کے زمانے میں بد دلی اور تنفر پھیلانے میں ساعی رہے۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں نے سرکار انگریزی کے بر خلاف جہاد کو ناجایز تسلیم کیا ہے کیونکہ اس نے دوسری اسلامی حکومتوں سے زیادہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی دے رکھی ہے لیکن سنہ ۱۸۲۳ء میں سکھوں کے خلاف جو جہاد ہوا تھا وہ اس سے کہیں مختلف تھا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں سکھوں پر بہت مظالم کیئے تھے۔ ان کے بزرگوں کو قتل اور ان کی عبادتگاہوں کو نجس کر دیا تھا۔ اب بدلے کا وقت آیا تھا اور اسلام کے پیروؤں کو گوبند سنگھ کے تابعین پامال کر رہے تھے؛

سردار ہری سنگھ نلوا ہزارے کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اس کی درشتی اور مسلمانوں سے نفرت و حقارت سے پیش آنے کی وجہ سے لوگ مذہبی جوش میں آکر اکثر ہنگامہ آرائیاں کیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۲۴ء میں دربند میں ہنگامہ برپا ہوا۔ اس کے دوسرے سال یوسف زئیوں نے سکھوں سے پچ گنی تعداد میں جمع ہو کر اسے گھیر لیا لیکن اس نے بڑے استقلال و بہادری سے لڑ کر انھیں شکست دی۔ اس کی مدد کے لیئے سردار بدھ سنگھ سندھن والیہ جیسا کار آزمودہ سپاہی روانہ کیا گیا۔ رنجیت سنگھ اپنے اس رشتے کے بھائی سے مشتبہ ہو گیا تھا اور اس لیئے اسے سرحد پر اس امید پر بھیج دیا تھا کہ وہاں کی جہمات سے دربار میں واپس آنا نصیب ہو۔ اس کے تنزل کی بنا یہ ہوئی کہ سنہ ۱۸۲۵ء میں جب

مہاراجہ امرتسر میں بہ مقام رام باغ بیمار پڑا تو طبیب اس کی زندگی سے بالکل مایوس ہو گئے بدھ سنگھ نے جو ایک ذی اقتدار سردار تھا اپنے بے باک اور ناعاقبت اندیش بھائی عطر سنگھ اور لہنا سنگھ کے ساتھ آیندہ خطرے کی پیش بندی کے خیال سے قلعہ گوبند گڈھ پر رات کے وقت دفعتہً قبضہ کرنے کی کوشش کی اس کا یہ خیال صحیح تھا کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد ملک گیری کے لئے جو تنازعات ہونگے اس وقت وہی شخص فایدے میں رہیگا جو اس قلعے پر قابض ہوگا۔ اس نے قلعے کے محافظین کو بہت سی رشوت دی اور مہاراجہ کے دستخط سے ایک جعلی حکمنامہ مرتب کیا جس میں قلعہ اس کے حوالے کیئے جانے کا حکم تحریر تھا۔ لیکن جمعدار خوشحال سنگھ کو جو قلعہ دار تھا جعل کا شبہ ہوا اور اس نے یہ جواب کہلا بھیجا کہ اگر خود مہاراجہ بھی آجائے تو شب کے وقت قلعے کا دروازہ نہ کھولا جائیگا۔ اس طور پر اس سازش میں ناکامیابی نصیب ہوئی۔ مہاراجہ نے صحت پانے کے بعد جب اس واقعے کو سنا تو اس نے بدھ سنگھ کو تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے کچھ دنوں ہزارہ بھیجنا مناسب سمجھا۔ یہاں اس نے نمایاں خدمات انجام دیئے اکوڑہ پر اس نے سید احمد شاہ کا مقابلہ کر کے انھیں شکست دی لیکن خود اس کے پانسو آدمی ضایع ہوئے۔ دوسرے دن وہ جگیرا کی جانب بڑھا جہاں ڈوگرے اور اٹاری کے سردار آکر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اب کل فوج کی تعداد دس ہزار نفوس اور ۱۲ توپیں ہو گئیں۔ ان کے مورچوں کو سید احمد صاحب کی کثیر مگر غیر تربیت یافتہ فوج نے گھیر لیا جس میں کابلی یوسف زئی اور افغان شامل تھے۔ کچھ دن تک تو سکھ مورچوں میں دشمنوں کے متواتر حملے ہوا کیئے لیکن جب رسد ختم ہو گئی اور بدھ سنگھ کو تاب نہ رہی تو اس نے دشمنوں پر حملہ کر دیا اور سخت و خونخوار لڑائی کے بعد انھیں شکست دی۔ سید احمد شاہ نے یوسف زئی کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور دو سال دم لینے کے بعد اس میں اس قدر سکت ہوئی کہ پھر میدان میں آیا۔

مہاراجہ اور ہری سنگھ نلوا دونوں بدھ سنگھ کی مدد کو نکل کھڑے ہوئے لیکن یہ دیکھکر کہ اب اس کو مدد کی ضرورت باقی نہ رہی انھوں نے افغان

صوبہ دار کو سید احمد شاہ کو کمک دینے کی پاداش میں سزا دینے کے ارادے سے پیشاور کا رخ کیا۔ شہر کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ بالاحصار میں آگ لگا دی گئی مسجد میں سے بے ادبی کی گئی اور بہت سے اشجار جن کے لئے پیشاور کی وادی مشہور تھی کاٹ ڈالے گئے۔ مہاراجہ خراج کی رقم میں اضافہ کر کے صوبہ دار یار محمد خاں کے فرزند کو بطور یرغمال اپنے ہمراہ لے کر واپس لاہور روانہ ہوا۔

پیشاور اور سرحد میں سکھوں کے تعلق کا اظہار ان ہی متواتر لڑائیوں۔ حملوں اور محاصروں سے ہوتا رہا تا آنکہ ۱۸۳۳ء میں شاہ شجاع نے جس کا حقیقی اقتدار گو برائے نام تھا لیکن اب تک وہ بادشاہ کے لقب سے موسوم تھا ملتان ڈیرہ جات اور پیشاور رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیئے۔ اس عطیے پر قبضہ کرنیکے لئے دغابازی یا زبردستی سے کام کرنا ضروری تھا۔ شہزادہ نونہال سنگھ اور سردار ہری سنگھ نلوا آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اضافہ شدہ خراج طلب کرنے کے بہانے سے شہر پر قبضہ کرنے کی غرض سے روانہ کیئے گئے۔ نونہال سنگھ نے دیواروں کے دیکھنے کے بہانے سے قبضہ حاصل کر لیا۔ بارق زئی سردار خفیف مقابلے کے بعد بھاگ گئے اور سکھوں کو وہ جگہ نصیب ہو گئی جس پر عرصے سے ان کا دانت تھا۔ لیکن افغانوں نے بغیر مقابلے کے قبضہ دینا گوارہ نہ کیا۔ ۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خاں نے اس ضلع پر اس ارادے سے حملہ کیا کہ اس شہر کو پھر واپس لے لیکن فقیر عزیز الدین نے جو اس غرض سے فوج کے آگے روانہ کیا گیا تھا کہ امیر کو بڑھنے سے روکے رہے ایسی کامیابی سے اس خدمت کو انجام دیا کہ سکھ فوج کثیر کے ساتھ آپہنچے اور افغانوں کو ایسا محصور کر لیا کہ امیر کو دروں کے اُس طرف بعجلت تمام فرار ہونا پڑا۔

سرحد کا مطیع کرنا سکھوں کی طاقت سے باہر تھا پیشاور پر قبضہ کرنے کے بعد نونہال سنگھ نے زبردستی ضلع بھر میں فوجی دورہ کیا۔ راستے بھر میں وہ آگ لگاتا لوٹ مار کرتا اور جس قدر محاصل دستیاب ہوئے انھیں وصول کرتا گیا دیوان حاکم رائے جو ۱۸۴۹ء میں باغیوں کا سرغنہ تھا بنو۔ ٹانک۔ ڈیرہ اسمعیل خاں اور عیسیٰ خیل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ سکھوں کو اس وحشی ملک پر حقیقی حکومت کبھی

حاصل نہ ہوئی اور ان کا اقتدار قلعوں کی چار دیواریوں سے متجاوز نہ ہو سکا۔ انھیں کبھی بغیر مسلح فوج کے لگان وصول نہ ہوا۔ ہر دوسرے تیسرے سال بقایا وصول کرنے کے لیئے فوج کا گزر اس ملک میں سے ہوا کرتا تھا۔ اس امر کی اطلاع جس طور پر ہوئی وہ بھی ایک لطیفہ ہے۔ لڑائی کے بعد ۱۸۴۷ء میں وزیر خزانہ راجہ دینا ناتھ نے انگریزی رزیڈنٹ کرنل لارنس کی توجہ ٹانک کے بقایا لگان کے جانب مبذول کراتے وقت بیان کیا کہ "تقریباً دو سال کا لگان بقایا میں ہے اور اب فوج بھیجنے کا وقت آگیا ہے"۔

سردار ہری سنگھ نلوا پیشاور میں سپہ سالار کی حیثیت سے ٹھیرا رہا۔ ۱۸۳۶ء میں اسے جمرود میں قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا گیا جس سے درۂ خیبر کے دہانے کی حفاظت ہو سکے۔ یہ کام بہت جلد انجام پا گیا۔ گو یہ مستحکم نہ تھا لیکن آفریدیوں پر کافی طور پر دھاک بیٹھ گئی اور کابل سے آنے والی فوج کی روک تھام اس سے ہو گئی۔ امیر اس بات سے بہت برافروختہ ہوا اور اس کی کوہستانی سرحد پر اس طرح تعمیر کرنے سے جو چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی اس پر وہ آمادۂ جنگ ہو گیا۔

اس نے سات ہزار سوار دو ہزار بندوقچی اور ۱۸ توپیں جلال آباد سے اپنے فرزند اکبر خاں کی سرکردگی میں روانہ کیں۔ اس کے اور تین فرزند بھی ساتھ ہو لیئے اور راستے میں بیس ہزار جرگے والے شریک ہو گئے۔ اپریل ۱۸۳۷ء کو یہ لوگ جمرود پہنچے جہاں صرف آٹھ سو سکھ بے سامان و رسد محافظت پر مامور تھے ہری سنگھ پیشاور میں بخار میں مبتلا پڑا تھا اس نے کوئی نقل و حرکت نہ کی۔ چھ دن تک بڑے سکون کے ساتھ محاصرہ برقرار رہا۔ اس عرصے میں دیوار میں اس قدر سوراخ ڈال دیئے گئے کہ سواروں کا دستہ اس میں سے گزر سکتا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ امید بالکل منقطع ہو چکی تھی ہری سنگھ اپنی تمام فوج چھ ہزار پیادے۔ ایک ہزار باقاعدہ اور تین ہزار بے قاعدہ سوار ہمراہ لیکر پیشاور سے بغرض امداد چل کھڑا ہوا۔

کئی دن تک تو مخالف افواج آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے رہیں اور کسی نے لڑائی آغاز کرنے کی خواہش نہ کی۔ بالآخر ہری سنگھ نے لڑائی کی ٹھانی پہلے پہل تو

اس کا حملہ ناقابل اندفاع ثابت ہوا اور افغانوں میں بے ترتیبی اور بھاگڑ پھیل گئی۔ لیکن جب سکھوں نے دور تک تعاقب کیا اس وقت افغان سواروں نے شمس الدین خاں کی سرکردگی میں اسے گھیر لیا۔ ہری سنگھ یہ دیکھ کر کہ سخت جدوجہد کے بغیر میدان ہاتھ سے جا رہا ہے اپنے خاص خاص سرداروں کے ساتھ فوج کے آگے آ کھڑا ہوا اور اپنی موجودگی و طرز عمل سے سکھوں کی ہمت افزائی کر کے اس نے مقابلہ جاری رکھا۔ ایسی صورت میں فتح حاصل ہونے کی پوری توقع تھی لیکن ہری سنگھ کے پیٹ اور پسلیوں میں دو گولیاں ایسی لگیں جس سے وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے لشکر نے بددل ہو کر جمرود کی فصیل کی جانب راہ لی اور وہاں پہنچ کر امداد کا منتظر رہا۔ جب کھانا پانی بالکل ختم اور محصورین بالکل بے دم ہو گئے تو اس وقت مدد پہنچی۔ محصورین کو اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ جس طرح سے ہو سکے دشمن کی صفیں چیر کر باہر نکل جائیں۔ افغانوں کے حملے کی خبر جب پہلے پہل لاہور پہنچی تھی تو ایک کثیر فوج نونہال سنگھ کی شادی کی تقریب میں جمع ہوئی تھی بعجلت تمام شمال کی جانب روانہ کی گئی خود نونہال سنگھ اس کا باپ کھڑک سنگھ جنرل ونٹورا جمعدار خوشحال سنگھ اور راوسنگھ بہادر اس فوج کے ساتھ ہو لیے اور یہ لشکر اس درجہ مہیب نظر آنے لگا کہ اوس کے پشاور میں بروقت پہنچنے پر بارق زئی سردار محاصرہ اٹھا کر بغیر کسی مقابلے کے جلال آباد کی جانب چلے گئے ۔

اس پریشانی و مصیبت کے زمانے میں مہاراجہ نے انگریزوں کے ساتھ اتحاد پورے طور پر قائم رکھا انگریزی حکومت خود ناقص مشورے کی بنا پر افغانستان میں اس غرض سے مداخلت کرنا چاہتی تھی کہ اس بہادر و قابل خاندان کو معزول کریں جس نے بہت زور پکڑ رکھا تھا اور اس کے بجائے سدوزی خاندان کو جو نہایت کمزور اور اس میں کسی قسم کی انتظامی صلاحیت نہ تھی مامور کرے۔ اس سے قبل لاہور کے نامہ و پیغام سے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے ساتھ جو انتظام کیا گیا۔ اس مہم کی کامیابی کے ساتھ آغاز اور اس کے انجام کے مصائب و آلام کا تفصیلی حال بیان کیا جا چکا ہے۔ اب یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ مہاراجہ کو یہ مہم بالخصوص ناگوار تھی۔ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ جس طرح

اس سے قبل ستلج میں اس کا اقتدار محدود کیا گیا تھا اسی طرح اب سندھ و افغانستان
میں محدود کر دیا جائے۔ لیکن پھر بھی اس نے سرکار انگریزی کی ان تجاویز کی تکمیل
میں حتی الامکان امداد دی۔ جن کو سر ولیم میکناٹن نے ۱۸۳۸ء میں اس کے سامنے
بیان کیا تھا۔ وہ خود بھی اس مہم میں شریک ہونے پر تیار تھا بشرطیکہ اس کے سردار
جنھیں انگریزوں کی اعانت بالخصوص ناگوار تھی اسے شرکت کی اجازت دیں۔ کیونکہ
اس وقت مہاراجہ کا ذاتی اقتدار بر سر انحطاط تھا اور جموں کے راجاؤں دھیان سنگھ اور
گلاب سنگھ کا اقتدار لاہور کے دربار میں بر سر عروج تھا۔

موسم سرما ۱۸۳۸ء میں جبکہ سرکار انگریزی کا فوجی مرکز افغانی مہم کے لئے
فیروزپور میں قائم ہوا اور گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ بڑے تزک و احتشام سے
لاہور میں مہاراجہ سے ملاقات کے لئے گیا تھا رنجیت سنگھ پر کثرت مے نوشی۔
ہجوم افکار و انتشار کی وجہ سے فالج کا دوسرا حملہ ہوا جس نے گویا اسے اس امر سے
متنبہ کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہمیشہ کے لئے فتوحات سے رخصت ہو۔ فالج
کے حملے کے دوسرے ہی سال اس کا انتقال ہو گیا۔ اس دورے کے بعد
سے دم واپسیں تک وہ گویا ادھ موا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کاروبار انجام دینے کی
کوشش کرتا رہا اور بعض اوقات فوجی پریڈ کے مواقع پر لاہور کے ثمن برج کے نیچے
کے میدان میں پالکی میں پڑ کر جایا کرتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ اب اس کا
آخری وقت ہے اور تمام طاقتور سردار جو اب تک اپنے آقا کے خوف سے
ایک دوسرے کی گردن دبانے سے باز رہتے تھے اس کشمکش کے لئے
آمادہ ہو رہے تھے جس کا اس کی موت کے بعد پیش آنا لازمی تھا۔

انگریز ڈاکٹر متعدد بار اس کا معالجہ کر چکے تھے۔ ۱۸۲۶ء میں مرے اور
۱۸۳۴ء میں فالج کی شکایت ہونے کے بعد ایم گریگر نے اس کا علاج کیا تھا۔
لیکن ان کے نسخوں سے اسے کچھ فایدہ نہ معلوم ہوا کچھ تو بیماری کے علاج پذیر نہ ہونے
کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس نے شراب کی کثرت ترک نہ کی۔ بجلی کے
دونوں طریقوں سے بھی اس کا علاج کیا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں نونہال سنگھ کی شادی
کی تقریب کے موقع پر سر ہنری فین کمانڈر ان چیف انگریزی عہدہ داروں کے

ساتھ شریک دعوت ہوا۔ اس ملاقات سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا کیونکہ
مہمانداری کے خیال سے اوس نے کثرت سے مے نوشی کی جس کی وجہ سے
۱۸۳۸ء میں اوسے دوبارہ فالج کا دورہ ہوا۔ اس کی علالت کے زمانے میں
فقیر عزیز الدین جو اوس کا معتمد اور خاص حکیم تھا بڑی دلدہی سے مصروف علاج ہوا۔
وہ اپنے ہاتھ سے اوسے دوا پلاتا اور تمام خبریں سنایا کرتا تھا۔ دوسرے مشہور
اطبا بھی طلب کیئے گئے لیکن گورنر جنرل نے جس ڈاکٹر کو روانہ کیا تھا اوس کے زیر علاج
ہونے سے اوس نے قطعاً انکار کیا۔ دوا سے اُس کا علاج ناممکن تھا جس طرح یونانی
حکما کے مشک عنبر لپیسے ہوئے موتی۔ صندل و بادام جو ہندوستانی قراباوین کی عمدہ
اور ضروری دوائیں ہیں روک تھام ہو رہی تھی اس نے اپنے اکلوتے صلبی فرزند
کھڑک سنگھ کو اپنے بستر مرگ کے قریب بلا کر اوس کی جانشینی کا اعلان کیا اور
دھیان سنگھ کو اس کا مدار المہام نامزد کیا یہ بہت بڑی کامیابی تھی لیکن اس
روباہ فطرت کے نصیب میں اس سے متمتع ہونا نہ بدا تھا۔ ننکانہ کے پوجاریوں اور
غریبوں کو جہاں پہلا گرو پیدا ہوا تھا اور ڈیرہ بابا نانک کے پروہتوں کو جہاں
بابا نانک کا انتقال ہوا تھا ۲۵ لاکھ روپے خیرات دینے کے بعد ہندوؤں اور
سکھوں کی رسم کے مطابق اسے چار پائی سے اتار کر فرش پر لٹا دیا گیا اور
۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو وہ راہیِ عدم ہوا۔؛

اس کے بعد چھ سال کی مدت فتنہ و فساد اور ہنگامہ آرائیوں میں گذری
جس میں قتل کا بازار گرم رہا اور غربا نہایت بے رحمی سے پامال کیئے گئے۔ خاندان کا
وارث جائز کھڑک سنگھ جو نہایت بزدل اور کمزور تھا اور اوس کا خوبصورت
بے پروا اور اوباش فرزند نونہال سنگھ دونوں وارث جائز قتل کیئے گئے اور اس کے
بعد جھوٹے مدعیوں کی باری آئی۔ مہاراجہ شیر سنگھ کو جو ہمیشہ مخمور و مدہوش رہتا تھا
مع اوس کے فرزند کے سندھن والیوں نے قتل کر ڈالا۔ دلیپ سنگھ کا بھی جو
ایک کسبی کا بیٹا تھا بہت جلد قتل ہی انجام ہوتا لیکن قسمت نے یاوری کی اور
سکھ فوج کے شکست ہو جانے سے اوسے سرکار انگریزی کا دامن عاطفت نصیب
ہوا۔ جس کی مکافات اچھی نہ ہوئی۔؛

رنجیت سنگھ کے کشت عمل کا ثمرہ ملا ۔ آبا و اجداد نے کھٹے انگور کھائے
اخلاف کے دانت کھٹے ہوئے جس مملکت کی بنیاد ظلم ۔ دغابازی اور خونریزی
سے ہوئی وہ اپنے بانی کے بعد عرصے تک قائم نہ رہ سکی اوس کی بنیاد ایک
شخص کی فوجی وملکی قابلیت اوس کی جان تھی ۔ اُس جان کے نکلتے ہی ریزہ ریزہ
ہو کے خاک ہوگئی اور خالصہ کی وراثت انگریزوں کو نصیب ہوئی ۔ اگر انگریز
انصاف ۔ سخاوت اور قوت سے حکومت کریں جو اوصاف بقائے سلطنت
کے لیئے لازمی ہیں تو وہ دوسرے حملہ آوروں سے اوسے ہمیشہ کے لیئے محفوظ
رکھ سکیں گے فقط

تمت بالخیر

غلط نامہ

صفحہ	سطر	باب	غلط	صحیح
۱	۹	۱	آلہ جنگ	آلۂ جنگ
۲	۳	۱	اتحاد پر	آثار پر
۳	۱۳	۱	نسلاً ابعد نسل	نسلاً بعد نسل
۳	۲۰	۱	اُن کا حافظ اور نگہبان	اُن کا محافظ اور نگہبان
۴	۱۹	۱	جنھوں نے	جو
۶	۳	۱	صورت حال میں یہ نہ ہوتی	صورت حال یہ نہ ہوتی
۶	۵	۱	تیھر کا سا ثبوت	پتھر کا سا ثبات
۶	۷	۱	یہ قوت انگریزوں کی بڑھتی ہوئی	یہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت
۷	۲۴	۱	اکثر پیشین گوئی	اکثر جو پیشین گوئی
۱۱	۹	۲	جس کو	جن کو
۱۲	۹	۲	انگریزی حکومت	انگریزی حکومت کو
۱۲	۱۰	۲	نقص	نقض
۱۵	۲۱	۲	قدرتی طور نے پلٹا کھایا	قدرتی طور پر حالات نے پلٹا کھایا
۱۶	۷	۲	یقین کر لیتے	یقین کر لیتے ہیں
۱۶	۲۲	۲	ہل بل	ہل جل

صفحہ	سطر	باب	غلط	صحیح
۱۷	۱	۲	پر رہتی ہے	پر رہنے سے
۱۷	۲۱	۲	مہاراجہ سے	مہاراجہ نے
۱۷	۲۵	۲	ایک ودس	ایک اور دس
۲۱	۸	۲	جیند	جیندھ
۲۱	۸	۲	کپورتھلہ نے	کپورتھلہ
۲۱	۲۴	۲	اپنے افسروں	اور اپنے افسروں
۲۴	۵	۳	کب	کیا
۲۷	۱۰	۳	سادھوں کا ساتھ	سادھوں کا ساتھا
۳۲	۱	۳	تلونڈی مقام پر	تلونڈی کے مقام پر
۳۷	۱۰	۳	اس مسئلہ	اس میں مسئلہ
۴۲	۷	۳	اپنے قوت بازو	اپنی قوت بازو سے
۴۳	۲۳	۳	نہیں دیتے	نہیں دیتی
۴۶	۱۰	۳	کی مانع سمجھی جاتی تھی	کا مانع سمجھا جاتا تھا
۵۰	۸	۴	ایرانی ہو	ایرانی ہوں
۵۰	۱۵	۴	طاقتور ہو جو	طاقتور ہو
۵۰	۱۸	۴	بارساز وسامان	باساز وسامان
۵۳	۵	۴	ہر دونوں کو	دونوں کو
۵۴	۲۱	۴	رنجیت سنگھ کو بیاہ دی تھی	رنجیت سنگھ کو ۱۷۸۶ء میں بیاہ دی تھی
۶۰	۸	۴	دیا جاما	دیا جاتا
۶۱	۸	۵	کوئی ایسی بات	ایک ایسی بات
۶۱	۹	۵	جاں جوکھوں	جان جوکھوں
۶۱	۱۴	۵	وہ اپنی علیٰ ذہانت	وہ اپنی اعلیٰ ذہانت
۶۴	۲۳	۵	صلہ دیے	صلہ دینے
۶۵	۲۳	۵	ہے	ہیں
۶۷	۵	۵	استشنا تھا وہ	استشنا تھا تو وہ

صفحہ	سطر	باب	غلط	صحیح
۷۰	۹	۵	نخیال بزرگ	خیالی بزرگ
۷۳	۲۵	۵	پیشاور	پیشاورس
۷۸	۱۱	۶	خیانت	خیانت کی
۷۸	۱۲	۶	انتخاب کیا جاتا	انتخاب کیا تھا
۸۰	۲۵	۶	جیند	جیندہ
۸۴	۸	۶	مرتبہ تحریرات	مرتبہ تحریرات
۸۴	۲۵	۶	دکھا دیا	دکھا دے
۸۷	۲۲	۶	مہاراجہ جبکا	مہاراجہ کا
۸۹	۴	۶	راجہ دینا ناتھ اور	راجہ دینا ناتھ اور
۹۲	۵	۶	لہنا سنگھ حسام الدولہ	لہنا سنگھ کو حسام الدولہ
۹۲	۹	۶	شکلات ظاہر ہوتے تھے	شکلیں ظاہر ہوتی تھیں
۹۲	۱۴	۶	گھرا ہوا تھا کبھی	گھرا ہوا تھا مگر کبھی
۹۵	۲۳	۷	سنہ ۱۸۰۹ء	سنہ ۱۸۰۹ء میں
۹۶	۹	۷	تنفر کرنے	تنفر کرنے
۹۹	۲۴	۷	اپنے ست	اپنے دوست
۱۰۰	۱۴	۷	قریب تھی) تھی	قریب) تھی
۱۰۰	۱۹	۷	وحکومت	اور حکومت
۱۰۲	۱	۷	باندھتے زرق برق	باندھے زرق برق
۱۰۴	۱۰	۷	زراعتوں تک	زراعتوں تک کو
۱۰۵	۱۷	۷	وقتیہ وقتی	وقتی
۱۰۱	۲۴	۷	دیکھا چاہئے	دیکھنا چاہئے
۱۱۰	۱۳	۸	نودہ سنگ	نودہ سنگھ
۱۱۶	۱۳	۸	دریائے جہلم سیلاب کے وقت	دریائے جہلم کو سیلاب کے وقت
۱۱۹	۱۰	۸	کانہ سنگھ جو	کانہ سنگھ نے جو
۱۱۹	۲۵	۸	شاہ صرے	شاہ درے

صفحہ	سطر	باب	غلط	صحیح
۱۲۱	۱۱	۹	بے پاک	بے باک
۱۲۱	۱۹	۹	نہ کہ سرکار انگریزی	سرکار انگریزی
۱۲۲	۹	۹	بڑرہی	بڑھ رہی
۱۲۳	۲۱	۹	اسکے ضلع	اس سے ضلع
۱۲۴	۲۳	۹	خانمہ	خاتمہ
۱۲۴	۲۴	۹	دیہاتوں	دیہاتیوں
۱۲۴	۲۵	۹	قطعۂ مالک	قطعۂ ملک
۱۲۶	۱۴	۹	ملکے اور	مل کے
۱۲۸	۱۵	۹	قرینے	دینے
۱۳۰	۱۸	۹	بالکلیتہ	بالکلیہ
۱۳۱	۴	۹	اگھڑے	اکھڑے
۱۳۴	۱۶	۱۰	کی بھی	کی تھی
۱۳۵	۲۰	۱۰	سکھ فوج سے	سکھ فوج نے
۱۳۶	۲۲	۱۰	کھڑا اور	کھڑا رہا اور
۱۳۷	۱	۱۰	پر سفید ریش	سفید ریش
۱۳۸	۶	۱۰	دوسری پہاڑی	دوسرے پہاڑی
۱۴۱	۸	۱۰	دوست محمد خاں	دوست محمد خاں نے کہا
۱۴۲	۲۳	۱۰	یہ مہم کا انجام تباہی	اس مہم کا انجام تباہی تھا
۱۵۱	۱۸	۱۰	اکثر ان ان پر	اکثر ان پر
۱۵۷	۲	۱۰	مسجدوں سے	مسجدوں کی
۱۶۰	۹	۱۰	لارڈ ابلینڈ ٹرے	لارڈ آکلینڈ بڑے

تمت

